قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۴۸ روپے
غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

جلد (۴۰)
اکتوبر ۱۹۸۷ء
نمبر ۱۰

فہرست

۱۔ لمعات ۲
۲۔ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ (محترم پرویزؒ صاحب) ۱۰
۳۔ حُسنِ تحریر ۲۳
۴۔ کیا ہم شرک نہیں کرتے؟ (محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ) ۲۷
۵۔ طلوعِ اسلام یورپی کنونیشن ۳۲
(رپورٹ محترم مقبول محمود فرحت صاحب،
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لندن)
۶۔ حقائق و عبر ۴۴
۱۔ مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی۔
۲۔ شاہکار رسالتؐ۔ ۳۔ شریعت بل یا دینِ اکبری
۴۔ فرقہ اہل حدیث کے دو دھڑوں میں سر پھٹول
۵۔ لاؤڈ سپیکر، فساد کا بہت بڑا سبب
۷۔ باب المراسلات (برما کے مظلوم مسلمان اور ۵۰
عالمِ اسلام کی ذمہ داری)
۸۔ کیا غیر مسلم بھی شریعت کورٹ کا جج بن سکتا ہے! ۵۳
(محترم حسن عباس رضوی صاحب)
۹۔ کاغذ کی ناؤ۔ بارش کا پانی۔ (محترم محمد اسلم رانا صاحب ۵۹
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کوپن ہیگن)

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۱۴۔

لمعات

تُونے وُہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

نفسِ انسانی کا ایک اہم گوشہ نفسِ غیر شعوریہ (UNCONSCIOUS MIND) ہے۔ کسی انسان کے گزرے ہوئے معاملات وحالات، کوائف وتاثرات کو نفسِ غیر شعوریہ آئندہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔ انکا بنیادی طور پر تعلق نفسِ شعوریہ یا حالتِ استراحت (CONSCIOUS MIND) سے ہوتا ہے۔ جب نفس شعوریہ ان حوادث وحالات کو بھلا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں ہوتے بلکہ وہ نفس غیر شعوریہ میں منتقل ہو کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص کسی وقت ان حالات وکوائف کے کسی ایک واقع کو سامنے لاتا ہے، تو اس کے ماضی کے تمام متعلقہ کوائف وحالات بواسطہ نفسِ نیم شعوریہ (SUBCONSCIOUS MIND) نفس شعوریہ میں منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ اس عمل کو (ASSOCIATION OF IDEAS) کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک واقع کو سامنے لانے سے اس سے متعلقہ تمام حوادث زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک ایک کر کے اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اُسی ترتیب سے سامنے آئیں جس ترتیب سے وہ نفسِ نیم شعوریہ سے گزر کر نفسِ غیر شعوریہ میں محفوظ ہوئے تھے۔

مثلاً جب ۱۱ ستمبر[1] کا دن آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ۲۵ دسمبر[2] کا دن سامنے آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلا توقف ۲۳ مارچ[3] ۱۹۴۰ء اور ۱۴ اگست[4] ۱۹۴۷ء کے دن سامنے آجاتے ہیں پھر ان ایام کے حوالے سے تحریکِ پاکستان کے مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ پھر اس تحریک کے سلسلہ میں ایک ایسی شخصیت سامنے آتی ہے جس کا نام والدین نے محمد علی جناحؒ رکھا اور قوم نے انہیں قائداعظم کے نام سے پکارا۔ اور تاریخ کے اوراق نے اُسے بطور بانیٔ پاکستان محفوظ کر لیا گیا۔

اب آگے بڑھیے! جب آپ محترم قائداعظمؒ کی ذات کو سامنے لائیں گے تو متذکرہ بالا عمل کی رُو

[1] قائداعظمؒ کی وفات کا دن [2] قائداعظم کی پیدائش کا دن۔
[3] جس دن قرارداد پاکستان پاس ہوئی تھی [4] جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔

سے آپ کو دو شخصیتیں قائداعظمؒ کے ہم رکاب نظر آئیں گی۔ ایک محترم علامہ اقبالؒ اور دوسرے جناب غلام احمد پرویزؒ۔ اقبالؒ کی ذات، علاوہ دیگر امور، سیاست میں مصورِ پاکستان کی حیثیت سے متعارف ہے۔ انہی کی کوشش بسیار کے نتیجہ میں قائداعظمؒ (جو ہندوستانی سیاست سے مایوس ہو کر انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے) وطن واپس آ کر اسلامیانِ ہند کے پاسبان کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور علامہ اقبالؒ کے منصوبے کے مطابق حصول مقصد کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

علامہ اقبالؒ نشانِ منزل بتا کر ہوئے رواں کی طرح آگے بڑھ گئے اور فکر و عمل کا تمام بوجھ حضرت قائداعظمؒ کے کندھوں پر آپڑا۔ لیکن اللہ کا احسان ہے کہ ایک اور شخصیت موجود تھی جس کے علامہ اقبالؒ کی ذات گرامی کے ساتھ معنوی اور فکری تعلقات وابستہ تھے۔ اور انہیں اقبالؒ ہی کی حیات میں حضرت قائداعظمؒ کے ساتھ صفِ اول کی رفاقت حاصل ہو چکی تھی۔ یعنی محترم غلام احمد پرویزؒ۔ ان کے علاوہ ایک اور شخصیت بھی تھی جن کا نام نامی سر سلیمان شاہؒ ہے۔ بقول پیر علی محمد راشدی (مرحوم) مسلمان سرکاری ملازمین میں سے صرف یہی دو شخصیتیں تھیں۔ جو لومتہ لائم اور انجام و عواقب سے لا پروا ہو کر حضرت قائد اعظمؒ کو انتہائی ضروری رفاقت و اعانت بہم پہنچا رہی تھیں۔ ورنہ دوسرے مسلمان افسر تو اورنگ زیب روڈ کے قریب سے گزرنے کی ہمت بھی نہ رکھتے تھے۔ مبادا انہیں کوئی دیکھ لے کہ وہ مسلم لیگ کے رہنما کے پاس آتے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں اصحاب انڈین گورنمنٹ میں ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے لیکن انہوں نے نہ تو اپنی اس پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور نہ ہی قائداعظمؒ کی رفاقت کے راستے میں اسے حائل ہونے دیا۔ جناب پرویزؒ کا تو یہ عالم تھا کہ وہ دفتری اوقات کے بعد قائداعظمؒ کی رہائش گاہ پر ہوتے۔ وہ سیکرٹریٹ میں اُس محکمہ میں تعینات تھے جو براہ راست وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے چارج میں تھا۔ وہ اپنی سخت مزاجی اور تعصب کی وجہ سے (پٹیل کا آدمی) کے نام سے مشہور تھا۔ جناب پرویزؒ کی پوزیشن، علمی لحاظ سے، اس قدر مستحکم تھی کہ باوجود اس کے کہ پٹیل کو ذاتی طور پر علم تھا کہ محترم پرویزؒ صاحب کے کھلے بندوں حضرت قائداعظمؒ سے روابط تھے، اُس کو جرأت نہ ہو سکی کہ وہ ان کو کوئی زک پہنچائے یا کم از کم ہوم ڈیپارٹمنٹ سے ان کا تبادلہ کسی اور محکمہ میں کرا دے۔ یہ عالم تھا محترم پرویزؒ صاحب کی وجاہت کا سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے!

اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ ۱۹۳۸ء میں مجلہ طلوع اسلام کا اجراء ہی اس مقصد کے لیے کیا گیا تھا کہ قرآن کریم کی روشنی میں قوم کو یہ بتایا جائے کہ حصول پاکستان کس طرح ہمارا دینی فریضہ ہے۔ کیونکہ جہاں تک انگریز اور ہندو

کے خلاف سیاسی محاذ کا تعلق تھا یہ بالاختصاص قائداعظمؒ کا ذاتی شعبہ تھا۔ لیکن خدا اور رسولؐ کے نام پر تحریکِ حصول پاکستان کی مخالفت کرنے والے (نیشلسٹ علما بالخصوص) مسلمانوں کے اپنے گروہ سے محاذ آرائی اور ان کے (بزعمِ خویش) مذہبی حملوں سے تحریکِ پاکستان کی مدافعت حضرت قائدِاعظمؒ کے ارشاد کے مطابق جناب پرویزؒ کے ذمہ تھی۔ مجلہ طلوع اسلام کا پہلا شمارہ ۸۔ اپریل ۱۹۳۸ کو شائع ہو گیا تھا لیکن انتظامی سہولت کی خاطر اسے مئی کا پرچہ قرار دیا گیا۔ ابھی پہلا پرچہ تقسیم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ داغِ مفارقت دے گئے۔ تاہم طلوع اسلام نے اپنی جدوجہد جاری رکھی تاآنکہ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد سے آج تک طلوع اسلام اپنی وسعت کے مطابق مسلسل اور پیہم نفاذِ نظامِ قرآن، جس کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی مسلم لیگ کے وہ اجلاس ہیں جو شملہ میں، انجمن اسلامیہ ہال، جسے منڈل ہال بھی کہتے تھے، میں ہوا کرتے تھے۔ اس میں جناب قائداعظمؒ لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ جب اُن کا خطاب ختم ہو جاتا تو وہی اجتماع بزمِ اقبالؒ میں تبدیل ہو جاتا اور اس کا باقاعدہ اجلاس شروع ہو جاتا۔ چونکہ یہ سیاسی تنظیم نہ تھی اسلئے اس میں جناب پرویزؒ خطاب کیا کرتے تھے۔ اس غیر سیاسی اجتماع میں سب کچھ وہی کہا جاتا جو اس سے قبل قائداعظم اپنے سیاسی خطاب میں فرما چکے ہوتے۔ لیکن اسے پیش کیا جاتا کلامِ اقبال اور قرآن کریم کی روشنی میں۔

موسم سرما میں جب سیکریٹیٹ کے دفاتر دہلی آجاتے تو وہاں مسجد رائے سینا میں بروز جمعہ محترم پرویز صاحب اسلام کے سیاسی نظام پر قرآن حکیم کی روشنی میں خطاب کرتے۔ ان کے علاوہ کمانڈران چیف کے میر منشی جناب حافظ عبدالحکیم اور جناب فتح محمد شیفتہ اسٹیبلشمنٹ آفیسر، سیکریٹیٹ بھی خطاب کرتے۔

اس کے علاوہ مسلم لیگ کا ایک گروپ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے احباب کا تھا۔ اور دوسرا مسلم لیگ کا نئی دہلی گروپ ہوتا تھا۔ جو مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کے حق میں اجلاس منعقد کیا کرتے تھے اور ان کا حلقہ اثر میرٹھ تک پھیلا ہوا تھا۔ ان سب گروپوں کی تگ و تاز کا محور مطالبۂ پاکستان تھا۔ ان سب کے میر رابطہ محترم پرویزؒ تھے۔

یہ تھی داستان جناب پرویزؒ کے شب و روز کی جن کا تعلق دہلی اور شملہ سے ہے۔

جناب پرویزؒ کے قائدِاعظمؒ کے ساتھ رفاقت کے حوالہ سے مولانا کوثر نیازی کی وہ تقریر سامنے آگئی جو انہوں نے روزنامہ جنگ، مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں اپنے کالم میں لکھی تھی، انہوں نے لکھا۔

دسمبر ۱۹۷۶ء میں پاکستان بھر میں، قائداعظمؒ محمد علی جناح کی صد سالہ تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائی گئیں۔ اس سلسلہ میں قومی اسمبلی اور سینٹ کے ایک مشترکہ اجلاس منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ میں بھی بانیٔ پاکستان کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر میں نے بھی تقریر کی۔ یہ تقریر اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ اب اسے قائدِ اعظمؒ کی یومِ ولادت کی مناسبت سے، قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی تقریر درج فرمائی ہے جس کے دوران کہا ہے۔

"مفتی صاحب! مولانا صاحب! لباس میں کیا رکھا ہے؟ جو کچھ ہے عمل ہے آیئے ترکِ رسوم کے اس موجد کا ایک واقعہ سنئے! جناح مذہبی تاجر نہ تھا مذہب کا مفکر تھا اور دنیاوی امور میں پروٹوکول کا شدت سے قائل و عامل، جس کو اپوائنٹمنٹ کے بغیر ملنے کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا، اس کی جلوت و خلوت میں اس شخص کو ہر وقت ہر لمحے تمام فارمیلیٹیز کے بغیر حاضر ہونے کی اجازت تھی جو انہیں کلام اللہ میں تدبر کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی سنایا کرتا تھا وہ خود مردِ حق ہے کہ ایک نشست میں، میں نے قرآنِ مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر مبارک اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اُٹھاتے گزر گئی ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بارِ الٰہی! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے بھی دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گزر جائے گی؟ اللہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا کہ:-

"تیرا مقصد تری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تو ہمارے پاس آجائے، اس سے تجھے کوئی سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے۔"

اس شخص نے لکھا ہے کہ یہ سن کر قائداعظمؒ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، کیوں؟ قائد ہی کے الفاظ میں سنیئے فرمایا:-

"جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کے لیے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا، خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتے گا؟ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے کہ نہیں"؟

یہ کسی صوفی کا ردِ عمل نہیں محمد علی جناحؒ کا ردِ عمل ہے۔ آپ نے بہت سی تفسیریں پڑھی ہوں گی۔ لیکن

اس آیت پر جناح جیسے عملی آدمی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ راوی لکھتا ہے اُنہوں نے کہا:۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی ورنہ خدا کا جواب تو بڑا خشک اور قانونی تھا اس واقعہ کے راوی ہیں جناب غلام احمد پرویز جن سے کسی کو ہزار اختلاف ہو لیکن قائدِ اعظم کے ساتھ ان کی رفاقت اور تحریک پاکستان میں ان کی قلمی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"

مولانا کوثر نیازی نے جو واقعہ بیان فرمایا ہے اس میں (غالباً بغرضِ اختصار) بعض کڑیاں چھوٹ گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے واقعہ میں ربط نہیں رہا۔ چنانچہ محترم پرویز صاحب نے قائدِ اعظم کے یوم وفات کی تقریب منعقدہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۶ء میں خطاب کرتے ہوئے، اور باتوں کے علاوہ، قائدِ اعظم سے اپنی قربت کی توجیہہ کے بارے میں بتایا:۔

"اور آخر میں ایک ایسا واقعہ جس کی یاد مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اکثر لوگوں کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ میری اور قائدِ اعظم کی پوزیشن میں اس قدر بُعد کے باوجود وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے مجھے اُن سے اس قدر قرب حاصل تھا۔ میرے اس زمانے کے قریبی احباب تو اس راز سے واقف تھے لیکن میں نے خود اس کا تذکرہ بہت کم کیا ہے۔ میرے اس قرب کی وجہ تھی اُن کا قرآنی ذوق۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے سے وقت لئے بغیر ان کی فرصت کے اوقات میں حاضرِ خدمت ہو جایا کروں۔ میں جب بھی حاضر ہوتا، پیش آمدہ معاملہ کے بعد، قرآن کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ میں نے ان جیسا ذکی الفہم انسان بہت کم دیکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ "خارے دید و احوالِ چمن گفت"، ذرا سے نکتہ سے پوری کی پوری بات فوراً سمجھ لیتے تھے۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی اکرمؐ کی ساری عمر (شریف) اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اٹھاتے گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں یہ حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بارِ الٰہی! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گزر جائے گی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے اس سے تجھے کچھ سروکار

نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے، یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے؟ میں روادروی میں یہ کچھ کہہ تو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ان کی آنکھوں میں آنسو بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے) یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی؟ فرمایا کہ میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کے لیے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا یہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا۔ خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد، تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتنے لگا۔ اس لیے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ اس پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے کس تارِ رگِ جاں کو چھیڑ دیا۔ میں نے اس احساس کی شدت کو کم کرنے کے لیے کہا کہ نہیں! حضورؒ کے مقصد کا حصول، حضورؒ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ یہ الگ بات ہے۔ لیکن خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ یہ کہہ کر وہ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس وقت تو مجھے اس کا علم و احساس نہیں تھا، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس گہری سوچ میں ان کے پیشِ نظر (شاید) اپنے پارسی معالج کے سیف میں محفوظ رکھا ہوا وہ ایکس رے ہوگا جس کا تذکرہ اب ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لینا۔ قانونِ خداوندی کے بے لچک ہونے کے ساتھ، ہمیں اپنے سامنے اسوۂ رسول اللہ ﷺ رکھنا چاہیئے۔ حضورؐ نے اس جواب کے ملنے کے بعد، اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقین محکم ہے۔ اعلان پاکستان کے بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس عدیم النظیر کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے بعد، مندرجہ بالا واقعہ کی یاد دلائی تو ہنس کر فرمایا کہ نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی۔ ورنہ خدا کا جواب تو بڑا روکھا پھیکا تھا۔

(طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۸۳)

یہ منظر کشی اُس قربت کی غماز ہے جو جناب پرویزؒ کو حضرت قائدِ اعظمؒ کے ساتھ حاصل تھی۔ اِس سلسلہ کی ایک اور کڑی صدرِ پاکستان کا وہ تعزیتی پیغام ہے جو انہوں نے جنابِ پرویزؒ کی وفات پر اُن کی بیوہ کے

نام بھیجا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا

"علامہ پرویزؒ کو تحریک پاکستان کے لیے کام کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ جس دوران میں، انہوں نے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کے خیالات و نظریات سے استفادہ کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنی زندگی اسلام کے مطالعہ کے لیے وقف کر دی اور اسلام کی تشریح و تعبیر اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کے مطابق کی۔ اس سلسلے میں اُن کے بہت سے پیروکار ہیں۔

علامہ پرویزؒ کو قدرت نے زورِ قلم سے نوازا تھا جسے انہوں نے اپنے نظریات کو نہایت پراثر انداز میں تفصیلاً پیش کرنے کے لیے کامیابی سے استعمال کیا۔ تحریک پاکستان کے ایک مخلص کارکن اور ایک عظیم و منفرد عالم کی حیثیت سے وہ مدتوں یاد رہیں گے۔

اللہ تعالےٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے اور آپ کو یہ نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ بخشے۔"

(طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵)

ان ایام کے علاوہ، جن کا تذکرہ آغازِ کلام میں کیا گیا ہے، طلوع اسلام کی تاریخ میں ۳ جون ۱۹۴۷ء کا دن بھی ایک یادگار دن ہے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو جناب پرویزؒ نے ۱۳ جون ۱۹۴۷ کو قائدِاعظم کو ایک تہنیتی چٹھی لکھی۔ قائداعظمؒ نے چودہ جون ۱۹۴۷ کو جناب پرویزؒ کی اس چٹھی کو .... ACKNOWLEDGE کرتے ہوئے اُن کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے کہا کہ وہ انہیں (قائدِاعظمؒ کو) ایسے قابل اعتماد افسران کے نام مہیا کریں جو پاکستان کے مستقبل کی سیکریٹریٹ کے صحیح خادم بن سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ قائدِاعظم نے اپنے اس خط میں جناب پرویزؒ کو DEAR MR: PERVEZ کے لقب سے مخاطب کیا ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے کوئی شخص کسی (اپنے سے) اعلیٰ شخصیت کو مخاطب کرتا ہے۔ ملاحظہ کیا آپ نے کہ حضرت قائدِاعظمؒ کی نظروں میں جناب پرویزؒ کا کیا مقام، اور کس درجہ قدر و منزلت تھی۔ یہی نہیں بلکہ قائدِاعظم کو جناب پرویزؒ کی صائب رائے اور بالغ نظری پر کس قدر بھروسہ، یقین اور اعتماد تھا کہ انہوں نے جناب پرویزؒ سے تحریری طور پر ایسے قابل اعتماد افسران کے نام طلب کئے، جنہیں پاکستان کے سیکریٹریٹ میں تعینات کیا جا سکے" اللہ اکبر!

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آخر میں ہم یہ اعتراف کرتے چلیں کہ ہم اسے اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ جس پیغام کا بیڑا محترم پرویزؒ صاحب نے اٹھایا تھا اور جس کے لیے وہ ساری عمر مصروف تگ و تاز رہے۔ اسے ساحل مراد تک لے جانے کی ذمہ داری کو ہم نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔ یعنی پاکستان میں قرآنی نظام کا نفاذ۔

...سے وسائل محدود ہیں تاہم جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے اُسے لے کر اس شاہنشاہ گدا نواز ...کے پاس التجا کے ساتھ حاضر ہو رہے ہیں کہ،

کوہِ آتش خیز کن این کاہ را　　　زآتشِ ما سوز غیر اللہ را
رہرواں را منزلِ تسلیم بخش　　　قوتِ ایمانِ ابراہیمؑ بخش

...اور ان التجاؤں کے ساتھ ہمارا قدم آگے بڑھ رہا ہے اور انشاء اللہ العزیز آگے بڑھتا ہی رہیگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

بقیہ: طلوعِ اسلام یورپ کنونشن

...تعین ہوتا ہے اس لیے سیاسی جماعتوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان کی تائید میں ہاتھ اٹھانے والوں کو ہر قیمت ...پر اپنے ساتھ رکھیں، لیکن آپ کی تنظیم ہم آہنگیٔ فکر و نظر کی بنیادوں پر استوار ہے اس لئے جو شخص اس قرآنی فکر کو عام کرنے میں دل و جان سے آپ کے ساتھ شریک نہیں اُسے باندھ کر ساتھ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ کس ذہنیت کا انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ اس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے ممبر بنالیں اور بعد میں اسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔ خارج ہونے کے بعد وہ کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کا اخراج اُس کی کسی غلطی، لغزش کی یا لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ وہ سارا الزام تحریک اور اس کے اربابِ بست و کشاد کے سر دھرے گا۔ اگر آپ شروع ہی میں اُس کا محاسبہ کر لیں اور اُسے اپنی جماعت کا رفیق بننے کا اہل نہ سمجھیں تو پھر اس کے لیے آپ کے خلاف کسی پراپیگنڈا کی گنجائش نہیں ہو گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے قابل بن جائے۔

طلوعِ اسلام کی بزمیں نہ سیاسی پارٹیاں ہیں نہ مذہبی فرقے۔ نہ ہی انہیں کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی یہ سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ اِن بزموں کا مقصد اس قرآنی فکر کی اجتماعی طور پر نشر و اشاعت ہے۔ جسے ادارۂ طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے اور بس۔

بقیہ: حقائق و عبر۔ از صفحہ ۴۹

سبب کا سدِ باب ممکن ہے۔"

اگر ایک فرقے کے مولویوں کے استعمال کی وجہ سے یہ فساد کی جڑ ہے، تو دوسرے فرقے کے علماء کے استعمال سے یہ حالت بدل تو نہیں جائے گی!

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟

تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعید میں مدینہ کے یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضورؐ کے استفسار پر بتایا گیا کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ اس یومِ مسرت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے شکرانِ نعمت کے طور پر، وہ اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور رسالتمآبؐ نے یہ سنا اور مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ بھی اس تقریب میں یہودیوں کا ساتھ دیں اور عاشورہ کا روزہ رکھا کریں کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے نجات صرف اسی قوم کے لیے وجہِ مسرت نہیں بلکہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے باعثِ شرف و سعادت ہے۔ حضور رسالتمآبؐ نے یہ واضح کر دیا کہ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو قوموں کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

۱۴ اگست کو ہماری حیاتِ ملّی میں یومِ آزادی کی حیثیت حاصل ہے اور اس دن پاکستان کے طول و عرض میں آزادی کا جشنِ مسرت بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ جشنِ آزادی ہمیں سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں اپنے اپنے ہاں یومِ آزادی کی تقریب اسی وفورِ مسرت سے مناتی ہیں۔ اس دن کی یاد میں ان کے ہاں بھی فضائیں مسرت کے نغمے گونجتے ہیں۔ خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ فضا جشنِ چراغاں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے اور مسرت کے ان ہنگاموں میں چار (۴) طرف یہ احساس کارفرما ہوتا ہے کہ اس دن ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹی تھیں۔ ان کی بے بسی اور محکومی کے بندھن کٹ گئے تھے۔ انہیں دوسروں کے استبداد سے نجات ملی تھی اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنی مملکت کے دائرے میں اپنی مرضی کے آئین و قوانین

سرنج کر سکیں۔ اپنی منشاء کے مطابق احکام کا نفاذ عمل میں لا سکیں۔ ان کی آزادی پر خارج سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔

یہاں یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہماری آزادی کا مفہوم اور منشاء و مقصود بھی یہی تھا؟ یعنی ہم جو جشنِ آزادی کی تقریب مناتے ہیں۔ کیا یہ بھی آزادی کے اسی تصور کا آئینہ دار ہے جو دیگر اقوام و ملل میں رائج ہے؟ پاکستان کو آزادی حاصل کیے سترہ برس ہو گئے۔ کہا جائے گا کہ اتنے سالوں کے بعد اس انوکھے سوال کو اٹھانے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ ہم نے کئی سالوں تک اپنی آزادی کی جنگ لڑی۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ اور اپنی آزاد مملکت میں زندگی بسر کرتے اتنے سال گذر گئے۔ اور اب یہ سوال کہ "ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟" کیوں اٹھایا جائے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آزادی کے منشاء و مقصود کے اہم اور بنیادی سوال کی طرف آئیں، ہم تمہیداً اس کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ سوال ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیا کر گیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حصولِ پاکستان کے بعد اکثر و بیشتر ان عناصر نے بھی پاکستان میں ڈیرے ڈال دیئے جو تحریک پاکستان کے دوران اس کی مخالفت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے تھے انہوں نے پاکستان کو اپنی جائے پناہ بنا لیا اور یہاں اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر ایسے پروپیگنڈے کی اشاعت شروع کر دی جو مایوسی اور ذہنی انتشار کا باعث ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم نے کم و بیش دس برس تک حصولِ پاکستان کے لیے مسلسل جدوجہد کی لیکن جب یہ حاصل ہو گیا تو ہم نے ایک دوسرے سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبے سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ اور ذہنی انتشار کی یہ کیفیت یہاں تک پہنچ گئی کہ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک نے کہا۔ اے صاحب! پاکستان تو ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کشادہ دلی سے کام لیتے تو پاکستان کے بننے اور بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ گویا پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ یہ محض ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی کہ حضرات! یہ انگریز کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ یہاں سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمیشہ لڑتے رہیں۔ چنانچہ اس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا اور مسٹر جناح کو اس مقصد کے لیے آگے بڑھا دیا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے آلۂ کار تھے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں کو بھی یہ اعتراف تھا کہ وہ کسی قیمت پر، کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا تھا۔

---

* یہ مضمون ۱۴ اگست ۱۹۶۴ء کو لکھا گیا تھا۔

یہ لوگ تو خیر تھے ہی تحریکِ پاکستان کے مخالفین تحریک پاکستان کی کامیابی کو انہوں نے اپنے لئے ایک گہرے زخم کے طور پر قبول کیا اور اس کی کسک سے انہیں آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے یہ حضرات جو کچھ کہتے ہیں اور کرتے ہیں وہ ان سے غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن ہمیں جس چیز سے افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ ایسے ممتاز شخص کا قلم بھی نامحسوس طور پر ایسے پراپیگنڈے میں معاون ثابت ہوا جن کا ان عناصر سے کوئی تعلق نہیں تھا ہماری مراد سابق چیف جسٹس آف پاکستان محترم محمد منیر صاحب سے ہے جنہوں نے پچھلے دنوں اخبارات میں (دو قسطوں میں) ایک اہم مقالہ شائع کیا۔ محترم منیر صاحب اس باؤنڈری کمیشن کے رکن تھے جس نے پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدوں کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے اس مقالہ میں انہوں نے کمیشن اور اس کے فیصلہ سے متعلق بڑے اہم اور مضمر حقائق کا انکشاف کیا۔ ان کا یہ مقالہ بڑا معلومات افزا اور حقیقت کشا تھا لیکن پتہ نہیں اپنے مقالہ کے آخر میں وہ کیوں ایک غیر متعلقہ سی بات کہہ گئے۔ ان سطور میں انہوں نے لکھا تھا کہ قیام پاکستان تک کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت کی صورت اختیار کرے گا۔

آیئے ہم دیکھیں کہ ہمارے جن قائدین نے پاکستان کا تصور دیا اور اس کو ایک محسوس پیکر عطا کر دیا کیا ان کے ذہن میں اس کے متعلق کچھ تھا یا نہیں۔ ہماری مراد علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی عظیم المرتبت شخصیتوں سے ہے جن کے فکر و بصیرت اور حسنِ تدبر سے ہمیں یہ مملکت ملی۔ ظاہر ہے کہ مملکتِ پاکستان کے بارے میں ان سے بڑھ کر کسی دوسرے کی شہادت قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصورِ پاکستان کو سامنے لائیں گے۔

دین اور مذہب کا فرق

یہاں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اقبالؒ پاکستان میں اسلام کو "مذہب" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "دین" کی حیثیت سے نافذ العمل دیکھنا چاہتے تھے۔ "مذہب" (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکارا جاتا ہے) خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتش کدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں، اور (اسی خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں — بلکہ یوں کہیئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں — اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی، تمدنی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تو ہے مذہب کا تصور۔ لیکن اس کے برعکس "دین" خدا اور بندے کے درمیان کسی

...کا نام نہیں ۔ بلکہ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظامِ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی ... تمام گوشوں کو محیط ہے۔

...اور خطبۂ الہ آباد

چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا ... میں فرمایا۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے ...... حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں بیراک نظامِ حیات ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے۔ جس کی رُو سے انسان، جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی)۔ اسی لیے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

نیشنلسٹ علماء کا تصورِ آزادی

ہمارے ہاں کے اُس وقت کے نیشنلسٹ علماء جن کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کا تصور وہی تھا جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

چنانچہ مولانا مدنی (مرحوم) کے اخباری بیان کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ مرحوم نے کہا تھا کہ:۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائے۔ اسی لیے میں کسی ایسی حکومت کے

قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا۔ جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا، چہ معنے دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا۔ بولنا۔ روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔

قائداعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کے قیام کی جدوجہد میں سالارِ کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے پاکستان اور اس کے نظامِ مملکت کے بارے میں بعینہٖ وہی تصور تھا جو علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں وہ شروع سے آخر تک اس حقیقت کو دہراتے چلے گئے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ نظریۂ زندگی کی وضاحت فرمائی بلکہ اس طرح دین اور مذہب کے فرق کو بھی نمایاں کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے، ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور میں، جہاں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی، تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

> میرے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت

اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں، اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے! ہندو اور مسلمان، زندگی کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے، یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ لاہور کے تاریخی اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس کروڑ مسلمانوں نے اُسے اپنے ملی نصب العین اور تقاضائے دین و ایمان کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا۔ بلکہ اس کے لیے آخری خندق تک لڑ مرنے کے لیے کارزارِ سیاست میں نکل آئے۔

اس قرارداد کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کیے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گذرا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے بھی ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران طلبا نے قائداعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کیے جن کے جوابات قائداعظمؒ نے ایسے متعین، دو ٹوک اور نکھرے ہوئے انداز سے دیئے کہ مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشاء و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا اور رینٹ پریس کے نمائندے نے اس ملاقات کی جو رپورٹ مرتب کی اس کے ضروری حصے سوالات و جوابات کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

سوال: - مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب: - جب میں انگریزی میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوے ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین

ہے، بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

قائداعظمؒ کا اپنے متعلق اعتراف و اعلان یہ ہے کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے۔" لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، ذرا غور کیجئے کہ دینیات میں مہارت کے مدعی کتنے ہیں جو اسلام کے متعلق اس گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں؟

سرِ خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ دُردکشاں از کجا شنید؟

سوال:۔ اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی ڈیماکریسی یہ سب اسلامی نظام کے مختلف اجزا کی بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ جب تک ان میں سے انسانی تصورات کو نکال کر، ان کی جگہ "خدا" شامل نہ کر دیا جائے، یہ مسلک نوعِ انسانی کے لیے کبھی ایسے منفعت بخش نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا خاصہ ہیں۔

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے، جو ہمارے نزدیک اس موضوع پر مقطع کا بند ہے۔ غور سے سنیئے۔

سوال:۔ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔

صرف قرآن کی اطاعت

قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بن سکتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لا الٰہ الا اللہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اسکے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک اَن دیکھی، مجرد ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیسے معلوم معلوم کیا جائے گا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں"، اسی لیے اس کا ارشاد ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ (۷/۳) جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو۔ "بالفاظِ دیگر" اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"۔ اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)، جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔

قائدِ اعظم کی دوٹوک وضاحت سے مملکت پاکستان کا بنیادی دستور ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی ادنیٰ شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کے آئین و قوانین کی اساس قرآنِ کریم کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ اسی کتاب کو ہمارے قوانین کا سرچشمہ اور احکام کا ماخذ قرار پانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہمارے نظامِ مملکت کے لیے کوئی دوسرا ماخذ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم کی عظمت اور جامعیت اُن کے دل و دماغ پر کس حد تک اثر انداز تھی اس کا اندازہ ان کے اکثر بیانات سے سامنے آئیگا۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں عید کی تقریب سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

قرآن کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لیے سول اور فوجداری قوانین

کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے۔ جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لیے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لیے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآنِ کریم کی عظمت اور جامعیت جس پر قائداعظمؒ کا ایمان تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا۔ (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے

مسلمانوں میں وجہِ جامعیت

بھی ان دونوں خطوں کے رہنے والوں میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہ اختلاف کے باوجود وہ کون سی قدر مشترک تھی جو ان باہمد گر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی؟ اس کا جواب قائداعظم کے الفاظ میں سُنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء۔ واقعہ کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے والے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائیگی۔ ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب فلہٰذا ایک اُمّت!

حصولِ پاکستان کے بعد

مطالبۂ پاکستان کے منشاء و مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان تک مختلف مواقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا اس کے چند گوشے نکھر کر آپ کے سامنے آ گئے۔ اب حصولِ پاکستان کے بعد کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہی حلقے جو حصولِ پاکستان کے مقاصد کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے درپے ہیں۔ یہ کہتے سنائی دیں گے کہ حصولِ پاکستان سے قبل بے شک قائداعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن اس کے حصول کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف قائداعظمؒ کی عظمتِ کردار پر ایک گھناؤنی الزام بازی ہے۔ بلکہ واقعات و حقائق کے سراسر منافی بھی۔ حصولِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظمؒ کے موقف میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آتی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے کراچی کے خالق دیناہال میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

پاکستان کا آئین

حصولِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئینِ مملکت کی ترتیب و تدوین کا تھا۔ اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت نقشۂ عالم میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھی اور ایک دنیا کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں کہ اس مملکت میں کس قسم کا آئین متشکل ہوتا ہے مشرق و مغرب کے انسان گوش برآواز تھے کہ اس سلسلے میں کارفرمایانِ مملکت کی طرف سے کوئی واضح اور دوٹوک اعلان سن سکیں۔ فروری ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ نے اس کی ضرورت محسوس کی اور اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق

ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) 'خدائی مشن' کو پورا کریں۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کیوں؟

قائداعظمؒ کا یہ اعلان مذہبی پیشوائیت کے لیے پیامِ موت سے کم نہیں تھا۔

یہاں اسلامی حکومت کے قیام سے یہ حضرات اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب یہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو شرعی احکام و قوانین اور فیصلوں کے لیے مختارِ ناطق وہی قرار پائیں گے۔ لیکن قائداعظمؒ نے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ قرآنی نظام ایسے کسی گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں کیوں اغیار کے آلۂ کار بن کے آگے بڑھے تھے اور ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ دراز آج تک کیوں نئے نئے فتنے بکھیرتا چلا آ رہا ہے۔ سترہ برس[1] سے یہاں اسلامی نظام کے نقاب میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں وہ تھیاکریسی قائم ہو جس میں اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جس میں انسانیت کا گلا بُری طرح سے گھُٹتا ہے۔ ان حضرات نے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کر رکھا ہے۔ اگر ملّت کو اس سے نجات مل جاتی تو اس کا سفینۂ حیات کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ اسی پیدا کردہ انتشار کا نتیجہ تھا کہ ہمارے عوام حصولِ پاکستان کے مقاصد سے دور ہٹتے چلے گئے اور ان کے لیے یہ سمجھنا تک مشکل ہو گیا ہے کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں گا؟

ذہنی انتشار کی یہ کیفیت بپا تھی کہ (DAYS To REMEMBER) کے عنوان سے محترم جسٹس منیر کا وہ مقالہ شائع ہوا جس کا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ محترم منیر صاحب نے اس مقالہ کے آخر میں کہا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت تک کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔

جسٹس منیر صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ بعینہٖ یہی بات بہت پہلے مودودی صاحب نے ان

[1] اب اسے چالیس برس کہیئے!

الفاظ میں کہی تھی کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

ہندو سب کچھ جانتے تھے

یہ تو ہیں پاکستان کے بارے میں ہمارے ہاں کی بھانت بھانت کی بولیاں یعنی ان حضرات کے نزدیک پاکستان کے ایک اسلامی مملکت قرار پانے کے متعلق نہ تو ہمارے رہنماؤں کے ذہن میں کوئی خیال موجود تھا اور نہ کوئی ایسا اعلان کیا گیا۔ رہنماؤں کے اعلانات تو آپ کے سامنے آچکے، اب یہ دیکھئے کہ تحریک پاکستان کے مقاصد اس قدر متعین اور واضح تھے کہ ہر ہندو رہنما تک ان سے بخوبی آگاہ تھا اور اسے اس میں ادنیٰ شک و شبہ نہیں تھا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں اور وہ یہ سب کچھ اس وقت سے بخوبی جانتے تھے جب کہ پاکستان کا مطالبہ پہلی بار دنیا کے سامنے آیا۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرس" کے صدارتی خطاب میں مشہور کانگرسی رہنما مسٹر منشی نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ:

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے (HOME LANDS) بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون ۲/۱۱/۴۱)

منافقت کا الزام

محترم جسٹس منیر صاحب کی تائید کرتے ہوئے نئی نسل کے ایک نوجوان نے پاکستان ٹائمز میں لکھا۔

پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء)

یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اقبالؒ و جناحؒ کے عطا کردہ پاکستان میں رہتے ہوئے کوئی پاکستانی ان جلیل القدر شخصیتوں پر ایسا الزام عائد کر سکے گا جس کی جرأت غیروں کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس الزام کی زد سب سے زیادہ قائداعظم پر پڑتی ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشی اقتدار کے حصول کے لئے

مطالبہ پاکستان کو جذباتی اور مذہبی نقاب پہنایا اور اصل غرض وغایت سب کی نگاہوں سے اوجھل رکھی۔
سنیئے کہ جناحؒ کے بارے میں غیروں کی رائے کیا تھی۔ مشہور کتاب (VERDICT OF INDIA) کے مصنف بیورلی نکلس نے آج سے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان میں کہا تھا۔

"میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک دنیا میری مخالف ہو گئی۔ لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں مسٹر جناحؒ کو جانتا تھا اور اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جناحؒ سے واقف نہیں"

یہ ہے جناحؒ کی عظمت کردار کی جچی تلی شہادت غیروں کی بارگاہ سے!

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ہماری قومی زندگی کا المیہ اب یہی نہیں رہا کہ نئی نسل جناحؒ سے واقف نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر دلدوز حادثہ یہ ہے کہ اس نئی نسل کے افراد اس پر یہ الزام عاید کرنے سے نہیں چوکتے کہ وہ ساری عمر منافقت سے کام لیتا رہا اور سیاسی ومعاشی اقتدار کے لیے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتا رہا ——

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

لیکن نئی نسل کو جناح کی شخصیت سے اس قدر بے خبر رکھنے کا ذمہ دار کون ہے! اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں کہ ہم نے نئی نسل کو تاریخ کی یہ عظیم حقیقت سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ اس عظیم مملکت کا حصول جناحؒ کی درخشندہ سیرت وکردار کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا یہ اس کی سیرت وکردار کی بلندی تھی جو انگریز اور ہندو کی منظم قوتوں کو شکست پر شکست دیتی چلی گئی اور جب تک پاکستان کا نام زندہ ہے جناحؒ کا نام بھی تاریخ کے صفحات پر جگمگاتا رہے گا۔ جناحؒ زندہ و پائندہ ہے اور ہمیشہ درخشندہ وپائندہ رہے گا۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فراغ
عشق ہے اصلِ حیات، مرگ ہے اس پر حرام

۱۴ اگست ۱۹۶۴ء　　　　　　پرویز

حُسنِ تحریر

قارئین کرام، سلام و رحمت!
پچھلی قسط میں فتح مکہ اور مابعد کی دلفریب منظر کشی وجۂ نشاطِ قلب و نگاہ بن چکی ہے۔ اس دفعہ اسی کے تسلسل میں جنگ حنین کے مناظر ملاحظہ فرمائیے۔ اور دیکھئے کہ محترم پرویز صاحب کی تحریر سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام کے کن روح پرور گوشوں کو سامنے لاتی ہے۔
محمد عمر دراز

جنگ حنینؓ

شوال ۸ھ

مکہ عربوں کا قومی مرکز تھا۔ اس کے فتح ہو جانے سے مختلف قبائلِ عرب کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور انہوں نے جوق در جوق آ کر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ (یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا) (واضح رہے کہ مکہ فتح ہونے پر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔) لیکن ہوازن اور ثقیف کے دو جنگجو قبیلے ایسے تھے جن کی آتشِ حسد و عداوت اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑے شد و مد سے مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپ مقابلہ کے لیے آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان، حنین کی وادی میں، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ بدر اور احزاب کے زمانہ میں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنی قوتِ بازو سے کہیں زیادہ بھروسہ تائید و نصرتِ قوانینِ خداوندی پر ہوتا تھا۔ حنین کی جنگ میں قریب بارہ ہزار کی مسلح فوج ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ اس دبدبہ اور طنطنہ سے صف آرا ہوئی کہ بعض صحابہؓ کی زبان پر بے اختیار آ گیا کہ آج ہم پر کون غالب

آسکتا ہے؟ دنیا میں مادی قوتیں نہایت ضروری ہیں لیکن اگر مادی قوتیں، قوت قلب (جسے قوتِ ایمانی کہتے ہیں) کو کمزور کرنے کا باعث بن جائیں تو یہی مادی قوتیں اس قوم کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں قوتِ ایمانی کی کمزوری کے معنی یہ ہیں کہ انسان ان اصول و اقدار کے مقابلہ میں جن کے تابع مادی قوت کو رکھا جاتا ہے، مادی قوت کو زیادہ اہمیت دے دے۔ یہ بات کسی وقت یونہی سہواً بھی ہو جاتی ہے۔

شکست

یہی چیز اس وقت ہوئی تھی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کے لشکر کا کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، دشمنوں کا ریلا بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ اپنی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی تھی۔ اس خلفشار میں ایک پیکرِ استقامت تھا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا، نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ پریشانی، نہ مایوسی تھی نہ ہزیمت کے کوئی آثار۔ یہ پیکرِ ہمت و استقلال خود ذات گرامی تھی جناب محمد رسول اللہؐ کی۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں آپ نے پوری جمعیت خاطر سے دائیں طرف مڑ کر آواز دی کہ یا معشر الانصار! نہ معلوم اس آواز میں کیا اثر تھا کہ بھاگنے والوں کے قدم وہیں رُک گئے اور پوری دل جمعی سے آواز دی کہ لبیک یا رسول اللہ لبیک! پھر حضورؐ نے بائیں جانب یہی صدا بلند کی اور اس کا یہی جواب گونج کر واپس آیا۔ پھر آپ نے دشمنوں کو مخاطب کر کے آواز دی کہ "انا النبی لا کذب" (بحوالہ بخاری) میں خدا کا پیغمبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں" اس لیے ہو نہیں سکتا کہ باطل ہم پر غالب آ جائے۔

اور فتح

چند ثانیوں میں پوری فوج پھر اس مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع تھی اور اس کے بعد ایک ہی حملہ میں میدان صاف تھا۔ سورۂ توبہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ (۹/۲۵)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے نازک موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی اُمید نہ تھی) اور جنگ حنین کے موقع پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) لیکن وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے

اس کے بعد:۔

ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ أَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹/۲۶)

پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین کے دل میں سکون پیدا کر دیا۔ اور ایسی فوجیں نازل کیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور (اس طرح) ان لوگوں کو سخت سزا دی جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی اور یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو انکار (کفر) کی راہ اختیار کرتے ہیں (یعنی ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے)۔

طائف کا محاصرہ

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج کفار طائف میں جا کر جمع ہو گئی۔ حضورؐ نے جا کر شہر کا محاصرہ کیا بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ چکا ہے تو آپ، محاصرہ اٹھا کر واپس تشریف لے آئے۔

حنین میں بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ اس کی تقسیم میں حضورؐ نے یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ قریش مکہ میں سے جو لوگ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے ان کی تالیفِ قلوب کے لیے انہیں زیادہ حصہ دیا جائے۔ (واضح رہے کہ تالیفِ قلب سے مراد "رشوت" یا لالچ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے دین کی خاطر کسی قسم کا نقصان اٹھایا ہو ان کے اس نقصان کی تلافی کر کے ان کی دلجوئی کا سامان کر دیا جائے) اس سے انصار کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ چونکہ رسولؐ اللہ اور مہاجرین کے اہل قبیلہ اور اعزہ و اقارب ہیں۔ اس لیے انہیں زیادہ مال دیا گیا ہے۔ نبی اکرمؐ کو بحیثیت امیرِ ملت تقسیم غنیمت کے کلی اختیارات حاصل تھے۔ آپ کے فیصلوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے خیال کو ابھرنے سے روک دیتے۔ لیکن یہ مستبدانہ آمریت تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی تھی۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ایک طرف فنِ بلاغت میں اعجاز کا حکم رکھتا ہے اور دوسری طرف ان قلبی تعلقات کو نکھار کر سامنے لا رہا ہے جو حضورؐ کو انصار کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔

مال غنیمت کی تقسیم

کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تم میں اتفاق و ائتلاف پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تمہیں دولت مند کر دیا۔

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور انصار ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ نہیں تم ٹھیک جواب نہیں دے رہے، تم یہ جواب دو کہ
محمدؐ! جب اور لوگوں نے تجھے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، جب لوگوں نے تجھے چھوڑ دیا
تو ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا۔ ہم نے تیری ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ کہتے جاؤ، اور میں ایک ایک فقرے پر کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ

اے انصار! یہ سب سچ ہے لیکن کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ!

اب کسے یارائے ضبط تھا مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے پکار کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! انہیں سب کچھ دیدیجئے۔ اور ہمارے لئے صرف "محمدؐ" کو رہنے دیجئے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے انہیں سمجھایا کہ اس رعایت سے کیا مقصود تھا۔ اور یوں ان کے "دل" کے ساتھ "دماغ" کو بھی مطمئن کر دیا کہ حضورؐ کا فیصلہ کس طرح عدل وانصاف پر مبنی تھا۔ اسلام میں بات منوائی ہی دل اور دماغ کے پورے پورے اطمینان کے ساتھ جاتی ہے اس میں نہ آمرانہ استبداد ہوتا ہے، اور نہ ہی خالص جذباتی اپیل۔ اس میں "عشق اور تدبر کی"، دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

حنینؔ کے چھ ہزار قیدی ابھی تک محصور تھے۔ آپ نے انتظار کیا کہ ان کے اعزہ واقارب آئیں تو فدیہ کی بات کی جائے۔ لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا تو آپ نے ایک سفارت کی درخواست پر سب کو احساناً چھوڑ دیا کہ یہی قرآن کا حکم ہے۔

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴)

معراج انسانیت۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء۔ ص ۲۸۸ تا ۲۹۱

---

[۱] بحوالہ بخاری و فتح الباری۔

ثریا عندلیب

کیا ہم شرک نہیں کرتے؟

ہم سب مسلمان جانتے ہیں کہ شرک کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بڑا ہی نہیں، اس قدر سنگین کہ اس کی بخشش ہی نہیں ہوگی۔ اسی لیے ہم جب کبھی شرک کی کوئی بات سنتے ہیں تو ہماری زبان بے اختیار توبہ توبہ پکار اٹھتی ہے۔ ہم اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے، اللہ میری توبہ! کے الفاظ دہرانے لگتے ہیں۔ اپنے اس عمل سے ہمیں یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم شرک نہیں کرتے اور ہم سے یہ سنگین گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم مشرکین کی صف میں شامل نہیں ہیں۔ یہ خود فریبی بھی عجب شے ہے۔ انسان کی ذات کے گرد ایسا رنگین جال بچھائے رکھتی ہے کہ وہ اس کی رنگینیوں میں گم ہو کر برے بھلے کی تمیز کھو دیتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے کام نہیں لے سکتا۔ اسی خود فریبی کے ہاتھوں ہم اپنا شمار مشرکین میں نہیں کرتے۔ لیکن آیئے آج ذرا قرآن کریم کی روشنی میں اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کیا واقعی ہم شرک نہیں کرتے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک کے ظلم عظیم ہونے پر ہمارا نظری طور پر ایمان ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کا فرمان ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (۳۱/۱۳) یوں قرآن کے حوالے سے ہم نے یہ کہہ تو دیا کہ شرک ظلم عظیم ہے لیکن شرک درحقیقت ہوتا کیا ہے؟ یہ سوچنے اور جاننے کی ہم نے کبھی زحمت گوارا کی ہے نہ اس کی ضرورت سمجھی ہے۔ ہم نے شرک کو بت پرستی تک محدود کر رکھا ہے اور یہ چیز ہمیں ورثے میں ملی ہوئی ہے۔ ہم سنتے چلے آرہے ہیں کہ مشرکین وہ لوگ ہوتے تھے جو اپنے ہاتھوں سے بت بناتے پھر ان کی پوجا کرتے اور ان کے سامنے سجدہ ریزی کرتے تھے۔ اس طرح وہ بتوں کو خدا کے ساتھ شریک کرتے اور انہیں خدا کے برابر درجہ دیتے۔ اس لیے شرک کو ظلم عظیم ٹھہرایا گیا۔ مگر ہم تو بت نہیں بناتے نہ ہی بت پرستی کرتے ہیں۔ پھر بھلا ہمارا شرک سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ سوچتے یا کہتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بت پرستی تو انسان کے اپنے حقیقی مقام سے ناآشنا ہونے کی جہالت کا ایک پہلو ہے۔ جبکہ ہم حاملین قرآن تو اپنا مقام پہچانتے ہیں۔ ہم کیوں بت پرستی کریں گے؟ مگر شرک

کی اور جو بیسیوں شکلیں قرآن نے بتائی ہیں وہ بھی تو ہمارے سامنے ہونی چاہئیں۔ اس آئینہ حقیقی کو سامنے رکھے بغیر تو ہم اپنا جائزہ نہیں لے سکتے۔ ہمیں اپنا آپ نظر نہیں آسکتا۔ یوں تو ہمارے ہاں قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کی بڑے زور شور سے تلقین ہوتی رہتی ہے۔ مگر اسے کیا کہیے کہ اس تلاوت قرآن میں ہماری نظروں سے سورہ الروم کی ۳۱ ویں آیت ہی اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ آیۃ کریمہ کہ جس میں دین قیم کی وضاحت کرتے ہوئے ہم مسلمانوں کو نظام صلوٰۃ قائم کرنے اور تقویٰ کے راستے پر چلتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ.... دیکھنا! تم توحید پرست ہو جانے کے بعد کہیں مُشرک نہ ہو جانا۔ توحید پرست ہوتے ہوئے مُشرک! کتنی عجیب سی بات لگتی ہے۔ قرآن نے یہ الجھن باقی نہیں رہنے دی۔ بات کو یوں ادھورا نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے مشرک ہونے کی وضاحت ساتھ ہی کر دی ہے یہ کہ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا۔ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔ پھر اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ ہر فرقہ اپنے طریقے کو درست سمجھتے ہوئے اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ہے قرآن کی واضح آیت کے مطابق فرقہ بندی و فرقہ پرستی کا وہ شرک جسے ہم نے صدیوں سے اختیار کر رکھا ہے اور یہ حقیقت خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ ہم تو سراپا شرک کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اس میں سے باہر نکل آنا تو جیسے ہمارے بس کی بات ہی نہیں رہی۔ ہم کیا اپنا جائزہ لیں گے ہمارے اندر کے شیطان نے تو ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اسی لیے ہم اپنے اپنے فرقے کے وفادار رہ کر دوسرے فرقوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بڑے خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ اس فاسد عقیدے اور باطل تصور سے کہ بس ہمارا ہی ایک فرقہ ناجی ہے باقی سب کے سب جہنمی۔ یوں بزم خویش اس آیۃ بینہ کی اہم ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ ہم شرک نہیں کرتے، دنیا پر یہ جتانے اور جھوٹ کو سچ بنانے کے اور گُر بھی ہمیں آتے ہیں۔ فرقہ بندی کو مکاتب فکر کا نام دینا ہماری ہی تو جدت پسندی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علمائے دین سے ہمیں یہ فتویٰ بھی حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی کی ممانعت نہیں، البتہ فرقہ پرستی سے روکا گیا ہے (بحوالہ جنگ نومبر ۸۶ء) گویا فرقہ بندی اور فرقہ پرستی الگ الگ بات ہے کسی کو یہ کہنے کی جرأت ہے نہ ضرورت کہ فرقہ بندی فرقہ پرستی ہی کی تو پیداوار ہے۔ اور یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔

شرک کے حوالے سے صرف یہ ایک نص صریح ہی ہمیں آئینہ نہیں دکھاتی، شرک سے متعلقہ دیگر تمام آیات کو بھی ہم نے پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ ہمیں اللہ کے بندے اور رسولؐ کے امتی ہونے کا بڑا دعویٰ ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ فرقہ پرستی شرک ہے۔ میرے بندے بننا ہے تو توحید پرستی اختیار کرو۔ ہمیں عملاً اس سے

...ہے۔ اللہ نے اس کے ساتھ ہی اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی یہ کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا
...ہُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین یعنی دین اسلام میں تفرقہ پیدا
...یں اور الگ الگ گروہ بن جائیں اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس اعلان خداوندی کے
...ہمارے اللہ کے بندے اور رسول کے اُمتی ہونے کے دعویٰ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ مگر ہم ہیں کہ اپنے
...کھے دعوے پر مُصر چلے آرہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک دین قائم کیا اور ایک امت بنائی
...تھی۔ ہم نے مختلف فرقوں میں بٹ کر اُمت کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کے باوجود ہم امت واحدہ ہونے کا ڈھنڈورہ
...یٹے جاتے ہیں۔ توحید تو خالصتاً قوانین خداوندی کا نام ہے۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ توحید پر بظاہر ایمان رکھتے
...یں اور اعمال ہمارے جذبات کے تابع ہوتے ہیں جبکہ قرآن کریم جذبات کی پیروی کرنے والوں کو مشرک قرار
...دیتا ہے۔ اس کا فرمان ہے اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر
...بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات کو ہی اپنا اِلٰہ بنالیا۔ یہی وہ سب سے زیادہ تباہ کن شرک ہے جو ہماری
...ت دپرستیوں سے جنم لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے جذبات ہی ان مفاد پرستیوں کے محرک بنتے ہیں اور جب
...انسانی جذبات خدا کے قوانین سے سرکشی برت کر اپنی من مانی کرنے لگیں تو قرآن اسے شیطنت سے تعبیر کرتا
...ہے۔ قوانینِ خداوندی سے منہ موڑ کر اپنے سرکش جذبات کے پیچھے لگ جانا ان کو خدا بنا لینے کے مترادف ہے
...جو بطور شرک ایسا سنگین جرم ہے جس کی مغفرت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے فیصلوں اور کاموں کی ذمہ داری
...لینے سے جو ڈرتے ہیں تو کیوں؟ اس لئے کہ جو شرک ہم نے اختیار کر رکھے ہیں ان سے ہماری کیفیت یہ ہوگئی
...ہے کہ ہمارے اندر وہ جرأت ہی نہیں جو ہم سے بلا تأمل یہ کہلوا سکے کہ ہاں یہ عمل مجھ سے سرزد ہوا ہے۔
...میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے ہی سورہ نحل میں فرمان ربّی ہے۔
وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ (۱۶/۳۵) اور جو لوگ شرک کرتے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرتے۔" اس ارشادِ خداوندی سے شرک
کرنے والوں کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ شرک سے وہ کس قدر پست حوصلہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے
اشرف المخلوقات ہونے پر بھی ناز ہے۔ اللہ نے اس شرف وعظمت سے ہمیں نوازا ہے۔ مگر کیا ہم نے انسانیت
کے اس مقام اعلیٰ کا احترام برقرار بھی رکھا؟ اس کا جواب اپنے خالق حقیقی کے کلام میں دیکھئے۔ سورہ
اعراف میں ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا یعنی اگر انسان ہمارے پروگرام مشیّت کے
مطابق چلتا تو یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتا۔ وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ لیکن یہ زمین کی پستیوں
سے چپک جاتا ہے۔ کیسے؟ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اپنے جذبات کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ یوں عزت وعظمت

کی بلندیوں سے گر کر ذلت و خواری کی پستیوں میں جا پہنچتا ہے۔ یہ ہے وہ نتیجہ شرک کرنے کا جو انسان کا کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔ اتنی واضح آیات کی موجودگی میں ہمارا شرک کی مختلف قسموں سے چمٹے رہنا آخر کس بناء پر ہے اور ستم پر ستم یہ کہ ہم اسے شرک سمجھتے ہی نہیں۔ جب باطل کو باطل تسلیم ہی نہ کیا جائے تو پھر حق کے راستے پر آنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ اور اگر حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا جائے تو تمام اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ یہ قرآن کی وعید ہے، جو اٹل ہے۔ سورہ الانعام کی ۸۹ ویں آیت اس کی ترجمان ہے۔ فرمان ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِي بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یہ (قرآن) خدا کی طرف سے عطا شدہ وہ رہنمائی ہے جس سے ہر وہ شخص جو صحیح راستے پر چلنا چاہے صحیح راستے کا پتہ نشان پا لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ شرک کریں یعنی اس حق کے راستے کے ساتھ (باطل کے) راستوں کو بھی ملا لیں تو ان کے اعمال ضائع چلے جائیں گے۔

ان آیات بینات کو ہم پڑھتے ہیں، بار بار پڑھتے ہیں۔ محض پڑھنے کے لیے پڑھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس رویے کے ساتھ ہم شرک اور توحید میں کیا تمیز کر سکتے ہیں؟ سورہ روم کی ۳۳ ویں۔ ۳۴ ویں آیات میں بتایا گیا ہے کہ توحید اور شرک کو ملا دینے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنی تمام توجہات کو خدا کی طرف مرکوز کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں۔ اور جب خدا کی رحمت سے انہیں سامانِ رزق و آسائش مل جاتا ہے، تو ان میں سے ایک گروہ اپنے نشوونما دینے والے خدا کے اقتدار و اختیار میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرنے لگتا ہے۔ کیا ہم اس گروہ میں شامل نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو بطور انسان یکساں طور پر واجب التکریم بنایا ہے اور مومن وہ ہوتا ہے جو نہ خود کسی انسان کے سامنے جھکتا ہے نہ کسی انسان کو اپنے سامنے جھکاتا ہے۔ سورہ اعراف میں آیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ جن لوگوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے خدا کے بندے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر زندہ انسانوں کو نہیں پکارا جا سکتا چہ جائیکہ مُردوں کو اپنی احتیاج پوری کرنے کا وسیلہ سمجھ لینا بلکہ ایسا صاحب اقتدار گویا وہ زندہ انسانوں کے مقدرات بنا اور بگاڑ سکتے ہیں پیروں۔ فقیروں کے مزار دن رات ہمارے ان اعتقادات کی گواہی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارا یہ کہنا کہ ہم شرک نہیں کرتے اپنی دانست میں معاذ اللہ خدا کو دھوکہ دینا ہے۔ مگر ہم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۹) شرک کا ظلم عظیم ہم نے فرداً فرداً ہی اختیار نہیں کر رکھا بلکہ اجتماعی طور پر

بحیثیت ایک قوم ہمارا نظام ہی مشرکانہ ہے۔ یہ یوں ہی کہہ دینے والی بات نہیں۔ اس کی توثیق قرآن کریم خود ان الفاظ میں کرتا ہے۔ هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۹/۳۳ یعنی خدا کی ذات وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت یعنی وہ نظامِ زندگی دے کر بھیجا جس نے انسانوں کے وضع کردہ تمام نظام ہائے حیات پر غالب آکر رہنا ہے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خدائے واحد کے مبنی برحقیقت نظام کو خالصتاً قبول و اختیار کرنے کی بجائے مختلف نظاموں میں پیوند سازی سے حق اور باطل میں مفاہمت کے خواہاں ہوں"۔ کیا ہمارا نظامِ زندگی بحیثیت مجموعی حق اور باطل میں مفاہمت کا نمونہ نہیں؟ ہم نے جو یہ راستہ اختیار کر رکھا ہے اسے ہمارے رب نے تو مقرر نہیں کیا۔ رب العالمین کے ہمسر تراش لینا اور ان کو اس کے ساتھ شریک کرنا یہ وہ راستہ ہے جس کی وضاحت قرآن نے سورہ الشوریٰ میں یوں کی ہے اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۴۲/۲۱ خدا کے یہ شریک وہ ہیں جو ان کے لیے دین (نظامِ زندگی) میں مختلف راہیں (شریعتیں) وضع کرتے رہتے ہیں ایسی راہیں (شریعتیں) جن کا حکم خدا نے نہیں دیا۔ ایسی ہی شریعتوں کو ان کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے اور ان سے اس کی اطاعت کراتے ہیں۔

کاش ہم نے غور و فکر کیا ہوتا تو ہم "ایمان دار مشرک" یہ سمجھ سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے صرف ایک نصب العین مقرر کیا ہے اور وہ ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ یہ ہے وہ ایمان جس کا مطالبہ سارے انسانوں سے کیا گیا ہے چاہے وہ پہلے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں۔ (اور انسانوں میں ہم بھی شامل ہیں) خالص توحید پر قولاً و فعلاً ایمان رکھے بغیر ہم شرک اور اس کی بیسیوں قسموں سے ہرگز ہرگز نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ شرک سے بچنے کے لیے ہمیں ہر آن اپنے ایمان و عمل کا احتساب کرتے رہنا ہوگا۔

بقیہ: کاغذ کی ناؤ

ذاتی نجات اور بخشش کے لئے عبادات کی تلقین کرتا ہے۔ اس لئے فطرت کے قوانین کا احترام ہو ہی نہیں سکتا دین چونکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے اس لئے دین پر پابند افراد دونوں طریق کا احترام دل کی گہرائیوں سے کریں گے اجتماعی طور اور انفرادی حیثیت سے بھی۔

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم کو یارا ہو تو کہو (امجد)

وما علینا الا البلاغ المبین ط

طلوعِ اسلام یورپی کنونشن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن نے مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۷ء بروز اتوار ایک روزہ یورپی کنونشن کا اہتمام کیا۔ جس کا تعارفی خطاب اور روئیداد درج ذیل کی جاتی ہے ہم بدرگاہِ رب العزت سجدۂ تشکر بجا لاتے ہیں کہ محترم پرویزؒ صاحب کی فکرِ قرآنی کی شمعیں اب "دیارِ فرنگ" میں بھی روشن ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ عظیم کی، اہلِ مغرب کی محفلوں میں، ان تبلیغی کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشیں۔

روئداد

یک روزہ طلوعِ اسلام یورپی کنونشن منعقدہ لندن مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۷ء

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب کی رحلت کے بعد اکثر احباب باہمی گفت و شنید اور خط و کتابت کے ذریعے یہ تجویز سامنے لاتے رہے کہ پرویز صاحب کی وفات کے بعد اس فکر کو عام کرنے کے لیے یہ ہمارا دینی فریضہ ہے کہ اجتماعی کوششوں کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اس سلسلے میں ایک تعارفی کنونشن کا انتظام کیا جائے۔ یہ تجویز کیا تھی راقم کی دیرینہ خواہش کی غیبی تائید تھی۔ ۱۹۷۸ء میں جب خاکسار پاکستان گیا تو پرویزؒ صاحب کو اس موقع پر لندن آنے کے لیے دعوت دی انہوں نے شکریہ ادا کیا اور معذرت چاہی وجوہات ان کی پیرانہ سالی، گرتی ہوئی صحت اور ادارہ کی عظیم مصروفیات ان کے یہاں آنے میں حائل تھیں۔ مذاقاً کہا کہ تم اور نمائندہ بزمِ لندن یہاں آجاؤ تو میں لندن چند دنوں کے لیے چلا جاتا ہوں۔

مارچ ۱۹۸۷ کی ماہانہ میٹنگ میں بزمِ لندن نے ایک روزہ کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس تجویز پر تمام حلقوں نے اس کا پُر جوش اور والہانہ خیر مقدم کیا۔ اور بزم لندن کے دفتر میں خطوط اور ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ بزمِ لندن نے مسلسل تین ماہ میں کنونیشن کے انعقاد کے پروگرام، دعوتی کارڈ، مدعوین کی فہرست اور دیگر ضروری انتظامی امور کو ساعت سعید سے قبل پایہ تکمیل پہنچایا۔

دنیا کے عظیم تاریخی شہر اور انگلینڈ کے دارالحکومت لندن میں بزم ہائے طلوع اسلام انگلینڈ کنونیشن کا انعقاد یورپ میں قرآنی فکر و نظر کی اجتماعی سعی و عمل کی طرف پہلا قدم تھا۔

بیرونِ پاکستان پہلی بزم طلوع اسلام لندن ۱۹۶۰ میں قائم ہوئی تھی اور بزم لندن کی خوش بختی تھی کہ پہلی یورپی کنونیشن منعقد کرنے کا شرف بھی لندن بزم کو حاصل ہوا۔

بروز اتوار ۳۰ اگست کو نوبے ہال ریڈلائن سکوئر لندن ساڑھے دس بجے MIDDLE BORO- SHEFFIELD BRAD FORD LEEDS- کے نمائندے اپنے قافلوں کی قیادت کرتے ہوئے تشریف لے آئے۔

بزم لندن کے دیگر رضاکار قیام و طعام کے انتظام، مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ کو ترتیب دینے میں مصروف عمل تھے۔

بعد ازاں برمنگھم کے نمائندہ رفقا کے ساتھ ایک کوچ میں اور آکسفورڈ۔ بلیک برن۔ راچڈیل۔ بولٹن ڈارون۔ کرالے۔ ناٹنگھم۔ کارڈف اور ساوتھ اینڈ اون سی south and - on - sea سے احباب ہال میں جمع ہو چکے تھے۔

شمع قرآنی کے ان پروانوں میں بیرسٹر، چارٹرڈ اکونٹنٹ، ڈاکٹر تھے۔ تاجر، دوکاندار اور مولانا حضرات بھی تھے بلکہ ان میں صنعتی شہروں کے مخلص فیکٹری ورکرز، آفس کلرک اور پنشن یافتہ مگر رگوں میں خونِ گرم لئے عمر رسیدہ بھی تھے۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

ٹھیک ۱۱½ بجے میزبان بزمِ لندن کے نمائندہ مقبول محمود فرحت نے مندوبین کو خوش آمدید کہتے ہوئے کنونیشن کے پہلے اجلاس کا آغاز کیا یہ مجلس انتہائی سادگی کا رنگ لئے ہوئے تھی نہ کوئی صدر نہ کوئی باضابطہ ایجنڈا۔

تمام نمائندگان باری باری اپنے تعارف کے ساتھ، طلوع اسلام سے وابستگی کا مختصر سا پس منظر اور اپنے رفیقان قافلہ کا تعارف کرا رہے تھے اور یہ سلسلہ ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

ان میں ایک نوجوان، افریقہ کا مسلمان بھی تھا۔ لیڈز بزم کی تبلیغ سے یہ نوجوان انگلش میں لٹریچر

نہ ہونے کے باوجود فکر قرآنی سے اتنا متاثر تھا کہ اس کے تاثرات سُن کر ہر کوئی وجد سے جھوم گیا۔ یہ سب احباب دور افتادہ شہروں کی صعوبتوں کو برداشت کر کے محض اس مقصد کے لیے جمع ہوئے تھے کہ قرآنی پیغام کو دیارِ غیر میں زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

۵۲ شریک مندوبین نے تحریک کو انگلینڈ میں مؤثر بنانے، بزموں کے مابین گہرے روابط قائم کرنے، اُبھرتی ہوئی نوجوان نسل کو تحریک سے متعارف کرانے کے لیے انگلش میں لٹریچر کی فراہمی۔ بعض بنیادی چیدہ کتب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے اور ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انگلینڈ میں ٹرسٹ کے قیام پر تجاویز پیش کیں۔

خوشگوار بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ آج کی نشست میں پیش کردہ تجاویز پر مزید غور و خوض کرنے کے لیے نمائندگان کی ایک مجلس مستقبل قریب میں بلائی جائے۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ سنجیدہ محفل دوپہر کے کھانے کے لیے اختتام پذیر ہوئی۔ ہماری بہنوں نے جس خوش اسلوبی سے اپنے فرائض کو نبھایا، وہ قابل ستائش و رشک تھا۔ ۵ منٹ کے اندر اندر کوئی شخص کھانے کی پلیٹ سے محروم نہ تھا۔ حاضرِ تناول کرنے کے ساتھ ساتھ احباب ایک دوسرے کو اپنے دکھ درد اور احوال و کوائف سُنا اور سن بھی رہے تھے۔

اسی اثنا میں بزم کے باہمت اور پُراخلاص کارکنوں نے کرسیوں کو ہال میں ترتیب دینا شروع کر دیا۔ ٹی وی اور ویڈیو نصب ہو چکا تھا۔ ہال کے باہر مطبوعات طلوع اسلام اور بے شمار موضوعات پر متفرق پمفلٹس کا سٹال آب و تاب سے آراستہ ہو چکا تھا تاکہ بوقت مقررہ $2\frac{1}{2}$ بجے کھلا اجلاس شروع ہو سکے۔ وقت سے پہلے ہی شرکاء تشریف لا رہے تھے۔ جماعت اسلامی کے ذیلی ادارے یو کے اسلامک مشن کے نائب صدر مقامی بارو (BOROUGH) کے کونسلر۔ کئی ایک ویلفیئر انجمنوں کے نمائندے۔ تحریک خلافت راشدہ کے صدر، مسلم کمیونٹی سنٹرز کے عہدیدار۔ مساجد کمیٹیوں کے عہدیدار۔ سبھی پرویزؒ صاحب کا درس قرآن سننے کے اشتیاق میں جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہال کے آخری گوشے تک تمام نشستیں پُر ہو گئیں۔ انتظامیہ کا قلب پیچ و تاب میں تھا کہ ہال اپنی تنگیٔ داماں کا شاکی ہو رہا تھا۔ لیکن مندوبین نے اپنی نشستوں کی پیش کش کر کے آسودگی پیدا کرنے کی سعی کی مگر مہمانوں کے ذوق و شوق کے آگے ہم بے بس ہو گئے اور تقریباً $\frac{50}{55}$ مہمان دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وقت مقررہ پر آغازِ جلسہ کا اعلان ہوا۔ محمد بشیر سیکریٹری بزم لندن نے سورۂ اخلاص کی تلاوت اور اس کا مفہوم از مفہوم القرآن پیشِ سامعین کیا۔ پھر نمائندہ بزم مقبول محمود فرحت نے مختصراً علامہ پرویزؒ صاحب، فکر پرویز اور تحریک طلوع اسلام کا تعارف کرایا (اس کی نقل لف ہذا ہے) جسے

بہت سراہا گیا۔

روشن عباسی صاحب نے کلام اقبال "توحید" از ضرب کلیم ترنم سے سنائی

کہ قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

شدت انتظار کے دل آویز ماحول میں پرویز صاحب کا درس قرآن سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات سے T.V. پر آیا تو کیف انگیزیوں اور وجد آفرینیوں کی فضا میں سامعین لکچر کی سماعت میں اس قدر محو اور نظریں ایسی جمی ہوئی تھیں کہ تنکا بھی فرش پر گرے تو سنائی دے سکتا تھا۔ ہال میں ایسا وجد آور سکوت اور مفکر قرآن کا حسن بیاں۔ ایک ایک جملہ اور ہر جملہ کا ایک ایک لفظ اپنے اندر علم و برہان کی ایک دنیا لیے ہوئے تھا کہ آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد لیکچر ختم ہوا تو حاضرین کے جذبات و احساسات و تاثرات جو ان کے چہروں سے جھلک رہے تھے، وہ زبان ادا کرنے سے قاصر اور ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ جب تک انکا حقیقت کشا خطاب رہا حاضرین پر ایک سحر طاری تھا۔

اس کے بعد محترمہ نصرت بخاری نے علامہ اقبال کی نظم لا الٰہ الا اللہ

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

جس کیف آور ترنم سے سنائی تو ہال میں تاثر کا ایک سماں بندھ گیا۔ اس کے فوراً بعد ذکر و فکرِ پرویز، طلوع اسلام کا مقصد و مسلک۔ فنڈامینٹل اسلام کے پمفلٹ مفت تقسیم کئے گئے۔ اکثر نے وہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیے اور دادِ تحسین دینے لگے۔ اسی اثنا میں لاؤنج LOUNGE میں چائے کی میزیں لگ چکی تھیں ہمارے محترم بزرگ رکن خواجہ محمد رفیق صاحب شدید علالت کے باوجود ہسپتال سے اس محفلِ قرآنی میں شرکت کے لیے آئے اور مہمانوں کے لیے گرم گرم خستہ سموسے بھی ساتھ لائے چائے نوشی کے ساتھ ساتھ مہمان بک سٹال کی طرف شہد کی مکھیوں کی طرح امڈ چکے تھے، اتنی ضخیم کتب کو پہلی مرتبہ دیکھ کر محوِ حیرت تھے۔ کتب ہاتھوں ہاتھ بکیں۔

پانچ بجے یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ اور احباب گلے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے۔ ابھی اپنے اپنے آشیانوں میں پہنچنے کے لیے انہیں مزید ۲½ گھنٹے کا سفر طے کرنا تھا۔

نمائندہ بزم نے ان احباب کو الوداعی سلام کہتے ہوئے کہا کہ یہ کنونشن ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر (جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا) کامیاب رہی ہے یہ پیش رفت چہ عجب آئندہ چل کر

ایک ایسے شجرِ طیبہ کا بیج ثابت ہو جس کی جڑیں پاتال میں اور شاخیں آسمان کو چھُو رہی ہوں۔

اُسی شام اور اگلے دن اکثر احباب نے فون کئے کہ واپسی سفر کے دوران وہ غور و خوض کرتے رہے تھے کہ اگلے سال ان کے شہروں میں ایسی کنونشن کے انعقاد کا انتظام کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ اُن کے ارادوں کو عملی جامہ پہنائے۔ محمد اکرم راٹھور صاحب کا مقالہ "پرویز صاحب کا بزموں کے نام پیغام" تو نظر سے نہیں گزرا۔ مگر عنوان کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ اسی قسم کا ہوگا جیسا ہم نے کنونشن کے موقعہ پر ممبران میں تقسیم کیا ہے۔ اُس کی فوٹو کاپی لف ہذا ہے۔

والسلام

مقبول محمود فرحت نمائندہ بزم لندن

پہلے کھُلے اجلاس سے نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لندن محترم مقبول محمود فرحت صاحب کا تعارفی خطاب

معزز خواتین و حضرات!

ہدیۂ سلام و رحمت آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری کا میں اپنی اور اراکین بزم کی طرف سے بہت ممنون و مشکور ہوں کہ

آپ آگئے تو رونقِ کاشانہ ہوگئی۔

پرویزؒ صاحب کا درس سنانے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ پرویزؒ صاحب کا مختصر سا تعارف پیشِ خدمت کر دوں۔

پرویزؒ صاحب ۹ جولائی ۱۹۰۳ کو بٹالہ ضلع گورداسپور، پنجاب (جواب انڈیا میں ہے) میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا مولوی چودھری حکیم رحیم بخش حنفی مسلک کے جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے۔ یعنی یہ گھرانہ شریعت اور طریقت کا گہوارہ تھا۔

پرویزؒ صاحب کی پرورش اور ابتدائی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے دادا جان انہیں ایک ذہین بچہ دیکھتے ہوئے ان کو ریاضتیں، چلہ کشیاں، سلوک کی منازل طے کرانے لگے اور یہ دم، تعویذ، کشف، کرامات کے تجربات کر کے تصوف کی وادیوں میں بڑی سرعت سے آگے قدم اٹھاتے رہے۔ بقول پرویزؒ صاحب ارتکازِ قوتِ ارادی CONCENTRATION of

MEMORY اور WILL POWER کو پختہ و تیز کرنے میں ان کو اس سے بہت مدد ملی۔ مگر بقول اُن کے انہیں اس کی بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑی یعنی خرابیٔ صحت آخر دم تک ان کے ساتھ رہی۔ پرویزؒ صاحب کہتے ہیں" میں مراقبے کے چلّے کاٹ تو لیتا تھا مگر چونکہ ذہن قدرت سے رسا پایا تھا، میں اکثر اس پر سوچتا تو یہ ایک فریبِ نفس نظر آتا۔ مگر دادا جان کی پُروقار شخصیت اور اُن کا احترام لب کشائی کے دامن گیر ہوتے۔

جب بسلسلۂ ملازمت لاہور آنے لگا تو دادا جان نے دو بزرگوں سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک علاّمہ اقبالؒ مرحوم اور دوسرا امام الدین نجّار (جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب تھے۔ ان "قطب" کو تو بس ایک ہی مرتبہ ملا۔ مگر علامہ اقبالؒ سے پہلی ملاقات کے بعد پھر ان کی وفات تک کئی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں ایک $\frac{۲۰}{۲۲}$ سال کا نووارد گمنام سا نوجوان اور وہ ایک معروف عظیم PERSOUALITY۔ لیکن علامہ اقبالؒ مرحوم کسی ملنے والے کے دل میں اپنی بلندیٔ مقام کا احساس تک پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ بہت جلد اس کے یار بن جایا کرتے تھے۔ قرآن فہمی کا طریقہ میں نے علامہ اقبالؒ سے اخذ کیا۔ اس کے بعد قرآن اور دین کے سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں وہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال کا یہ مجھ ذرۂ ناچیز پر اتنا بڑا احسان ہے جس سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد بسلسلۂ ملازمت میں نئی دلی گیا تو وہاں ساؤتھ انڈیا (بنگلور) کا ایک وِدّوان گیتا کے فلسفے پر مسلسل لیکچرز دینے آیا۔ وہ ویدانت کا عالم اور فلسفہ کا پروفیسر تھا۔ جسے سنسکرت کے علاوہ بیشتر مغربی علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ میرا ذوقِ تجسّس حقیقت مجھے کشاں کشاں اس کے لیکچروں تک لے گیا۔

میں نے سنسکرت اور ہندی زبان بھی پڑھی تھی۔ چنانچہ میں اس گیتا اچاریہ کے پیش کردہ فلسفہ کے اسقام و تسامحات پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی قیام گاہ سے اُٹھ کر میرے ہاں چلا آیا۔ اس نے مجھ سے قرآن حکیم کے حقائق و معارف سمجھنے شروع کر دیئے اور میں اس سے گیتا کے درس لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے زیرِ ہدایت یوگ کی مشقیں بھی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں، میں نے دیکھا کہ ان یوگ کی مشقوں اور ہمارے تصوّف کے مراقبوں میں صرف طریقِ کار کا فرق ہے۔ ماحصل دونوں کا ایک ہے۔ یعنی قوّتِ خیال کا ارتکاز، جو ایک فنی شے ہے۔

اس کے بعد میں نے ماڈرن تصوف یعنی HYPNOTISM کو STUDY کیا۔ میں نے دیکھا کہ یورپ و امریکہ کے ہسپتالوں میں ہپناٹزم کے ذریعے بڑے بڑے MAJOR OPERATIONS کر دئیے جاتے ہیں۔ فرق صرف اسے کہ ہمارے ہاں دانت درد، سر درد دُور کرنے والا یا ہسٹریا کی مریض بیچاری

نوجوان لڑکی کا جن نکالنے والا، ولی اللہ اور حضرت صاحب بن چکا ہے اور یورپ و امریکہ میں وہی کچھ کرنے والا ڈاکٹر کا ڈاکٹر ہی رہتا ہے۔

پرویزؒ صاحب کہتے ہیں "میں نے جب RATIONALLY ان پر غور کیا تو یہ سراسر ایک فریبِ نفس اور نظر کا دھوکہ ثابت ہوا۔ اس طرح آہستہ آہستہ میں نے جھاڑ پھونک، تعویذ دھاگے، دم، وظیفے، ورد وغیرہ چھوڑ دیئے اور دست الست کی دنیا سے نکل کر قرآن کی طرف آیا۔ اور علامہ اقبالؒ کے بتائے ہوئے طریقے سے جب قرآن کو قرآن ہی سے سمجھا تو انسانی زندگی کے مسائل کا حل خود بخود ملتا گیا اور میرے سامنے زندگی کی راہیں کھلتی اور کشادہ ہوتی گئیں۔

تصوف کی بھول بھلیوں سے نکل آنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہ صرف قرآن اور رب العزت کا مجھ پر کرم تھا جس کے لیے میں ہر سانس میں اللہ تعالےٰ کا شکر گزار ہوں"

دلی آکر ملازمت کے ساتھ ساتھ دین اسلام کے مختلف گوشوں اور موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کئے جو اس زمانے کے مشہور جرائد ماہنامہ معارف اور دکن سے شائع ہونے والے رسالہ، ترجمان القرآن، میں شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔ اس حوصلہ افزائی سے انہوں نے اپنی علمی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور پھر اگلے ۵۰ سال میں بے شمار ضخیم کتب تصنیف کیں جن کی تفصیل آپ کو اس جلسہ کے بعد ایک پمفلٹ میں مل جائے گی۔ ۱۹۳۸ء میں جب قائداعظمؒ نے تحریک پاکستان کو عام کیا تو ماہنامہ طلوع اسلام کا اجرا اس مقصد کے لیے عمل میں لایا گیا کہ ملک و قوم کو یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کس طرح اسلام کا بنیادی تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کو کس طرح چومکھی لڑائی لڑنی پڑی، اس کی تفصیل اُس زمانے کے طلوع اسلام کے پرچوں سے مل سکتی ہے۔ انگریز اور ہندو کے علاوہ خود مسلمانوں کے قومیت پرست افراد اور نیشنلسٹ پارٹیاں، مثلاً مجلس احرار، جمیعت علمائے ہند۔ سرحد کے سرخپوش RED SHIRTS۔ بہار کے انصار، جماعت اسلامی وغیرہ سب اس کی مخالف تھیں۔

قائداعظمؒ کے ساتھ علامہ پرویزؒ صاحب کے تعلقات کیسے تھے اس کی شہادت مولانا کوثر نیازی نے نیشنل اسمبلی میں اور دوسرے سندھ کی مشہور شخصیت پیر علی محمد راشدی نے دی ہے کہ پرویزؒ صاحب قائداعظم کو بغیر APPOINTMENT PREVI ، جب چاہیں مل سکتے تھے۔

جب پاکستان وجود میں آگیا تو طلوع اسلام کے سامنے یہ سوال آیا کہ جس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا ہے اسے آئینی پیکر میں کس طرح ڈھالا جائے۔ نظامِ حیات کے خدّ و خال کیا ہیں۔ اسلامی

مملکت کسے کہتے ہیں۔ اور قرآن حکیم کے مطابق اس کے بتدریج قیام کی عملی شکل وصورت کیا ہے۔ اس نے مروجہ اسلام کے ہر گوشے کو قرآن کی روشنی میں جانچا اور پرکھا اور تسلسل وتکرار کے ساتھ اس پیغام کو عام کیا۔

اس مشن کو مزید تیز تر کرنے کے لیے پرویزؒ صاحب نے ملازمت سے قبل از وقت پنشن لے لی اور اکتوبر ۱۹۸۴ء تک ہمہ تن مصروفِ عمل رہے۔

تحریک طلوع اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک خالص فکری تحریک ہے، یہ عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتی، کوئی شورش برپا نہیں کرتی، نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرتی ہے۔

طلوع اسلام نے اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی، نہ کوئی نیا فرقہ بنایا ہے۔ وہ پارٹی بازی اور فرقہ سازی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے۔ مسلمان اپنی IDEOLOGY کی بنا پر تمام غیر مسلموں سے الگ ایک پارٹی ہیں، اس لیے اُمت کے اندر پارٹی یا فرقہ، دین کی وحدت کو پارہ پارہ کر لیتا ہے۔

طلوع اسلام کیونکہ قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے اور قرآن کو ملک کا ضابطۂ حیات بنا لینے سے مذہبی پیشوائیت PRIEST HOOD کا خاتمہ ہو جاتا ہے، لہٰذا مولوی حضرات نے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے یہ بے بنیاد پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ کہ پرویزؒ منکر حدیث ہے، تین نمازوں اور نوروز کا قائل ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں یہ واضح کر دوں کہ پرویزؒ صاحب جتنے منکر حدیث تھے اُس سے کہیں بڑھ کر منکر حدیث مودودی صاحب مرحوم تھے۔ وہ مروجہ اسلام کو جامد شاستر سے تعبیر کرتے تھے۔ پرویزؒ صاحب کہتے تھے کہ یہ اسلام دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ اِسے رسول اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے عہد زریں کے دور کے اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مگر پروپیگنڈہ اتنا شدید کہ مودودی صاحب منکر حدیث نہ ٹھہرے بلکہ اس لقب کا ہدف پرویزؒ صاحب ہی بنے۔ اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں۔

شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کا ادب کرتے ہیں

یہاں یہ بات آپ کے لیے باعث دلچسپ ہو گی کہ تقسیم ہند سے بہت قبل جب مودودی صاحب حیدر آباد میں تھے تو دلّی آنے پر پرویزؒ صاحب سے مختلف مسائل پر لمبی لمبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ جب تک مودودی صاحب حیدر آباد واپس نہ جاتے یہ سلسلہ جاری رہتا۔

مروجہ اسلام کس قسم کا ہے۔ اس کی تفصیل بھی آپ کو ایک پمفلٹ میں مل جائے گی جو مفت تقسیم کیا جائے گا۔

احادیث کے بارے میں طلوع اسلام کا کیا موقف ہے؟ اس کی وضاحت بھی ایک الگ پمفلٹ میں آپ کو مل جائے گی۔

شروع شروع میں یہ فکر انفرادی طور پر پھیل رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے معاونین اور متفقین کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور جب صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ :-

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

تو تجویز ہوا کہ ایک شہر، قصبہ یا علاقہ کے ہم خیال احباب اپنے مقامی حالات کے مطابق اس فکر کو اجتماعی طور پر آگے دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس تنظیمی شکل کا نام بزمِ طلوعِ اِسلام ہے۔

ان بزموں کا مقصد اور مشن، طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔ انہیں سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جب خاکسار انگلینڈ آیا تو اسی سال نومبر میں بزم لندن کا قیام عمل میں آیا۔ مصورِ پاکستان جناب عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کے برادرِ نسبتی گلزار چغتائی مرحوم اس کے پہلے نمائندہ مقرر ہوئے۔ دوسرے نمائندہ مقصود حسین کیانی مرحوم تھے۔

بعد ازاں بریڈفورڈ۔ برمنگھم اور اب مڈل برا۔ لیڈز۔ شیفیلڈ۔ بلیک برن۔ راچڈیل۔ کرائے۔ آکسفورڈ ساؤتھ اینڈ۔ ناٹنگھم وغیرہ میں حلقۂ احباب و بزمیں قائم ہو چکی ہیں۔ ان بزموں کا مقصد یہ ہے کہ اسلام خالص کو RATIONAL انداز میں LOGICALLY اس طرح پیش کیا جائے کہ آج کے زمانے کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کے دلوں میں ابھرنے والے سوالات و اعتراضات کا جواب مل جائے۔ بزم لندن کے دفتر سے تحریک طلوعِ اسلام کا لٹریچر یعنی کتب، پمفلٹس AUDIO CASSETTS دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پورے قرآن مجید کا درس تقریباً 675 کیسٹس پر مشتمل ہمارے پاس محفوظ ہے۔ جس سورت۔ آیات کی CASSETT درکار ہو وہ قیمتاً مل سکتی ہے۔ VIDEO کی کیسٹ LEEDS بزم سے دستیاب ہیں۔ بزمیں اپنے ممبران کے تعاون سے سرگرم عمل ہیں۔ یہ صدقات، چندے، خیرات اور زکواۃ وصول نہیں کرتیں۔

اللہ کے فضل سے بزموں کا دامن جدید و قدیم کی ہر آلائش سے پاک ہے۔ آپ میں اکثر بیشتر احباب سے میرے ذاتی مراسم ہیں۔ مدتوں بعد آج آپ سے طلوعِ اسلام کی نسبت سے ملاقات ہوئی ہے۔ خدا کرے جس طرح آج آپ ملے ہیں اسی طرح ہر سال ملاقات ہو۔ میں آپ سے جگر مراد آبادی کا یہ شعر کہہ کر رخصت ہوتا ہوں:

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں

محبت کا زمانہ یاد آ رہا ہے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

والسلام

مقبول محمود فرحت

انگلستان میں مقیم اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام پیغام

تحریکِ طلوعِ اسلام اور قرآنی نظام

طلوع اسلام جو قرآنی فکر پیش کرتا ہے، اس کے متعلق بعض حضرات یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس فکر کو عام کر بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ قرآن کا مقصد تو اس نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ کیا اس فکر کی عام نشر و اشاعت سے یہ نظام متشکل ہو جائے گا؟ اس کے جواب میں محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب نے مختلف موقوں پر جو کچھ لکھا ہے اُس کا ملخص یہ ہے: کہ اب تو خود زمانے کے تقاضوں نے حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ کسی خیال کے عام کر دینے سے معاشرہ کا نظام خود بخود اس کے مطابق متشکل ہو جاتا ہے، یہ زمانہ جمہوریت کا ہے، جس میں انقلاب آئینی طور پر برپا ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جس خیال کے حامل زیادہ ہوں، اُسی کے مطابق نظام قائم ہو جائے۔ ہم پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں۔

پس اس سلسلہ میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس نظام سے متعلق لٹریچر زیادہ سے زیادہ اور مختلف زبانوں میں عام کیا جائے۔ آپ اس فکر کو عام کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح ایک قطرۂ خون بہائے بغیر یہ انقلاب معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ کچھ گرم جوش حضرات جو ہماری تحریک کے نہایت سطحی نظر سے مطالعہ کے بعد ہم سے ہمنوا ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑی دُور ساتھ چل کر اس قافلہ کی سُست رفتاری سے اکتا جاتے ہیں اور تقاضے شروع کر دیتے ہیں کہ اس پروگرام میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں اور شورش انگیزیاں شامل کرنی چاہئیں، جب ان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو وہ اس قسم کی بحثیں شروع کر دیتے ہیں جن سے افرادِ کار کے ذہنوں میں انتشار ابھرے اور دلوں میں افسردگی پھیلے۔ اس قسم کا عنصر ہماری تحریک کے لیے بہت نقصان رساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اکثر اس کی تاکید کرتا رہتا ہوں کہ یہ عنصر آپ کے ہاں بار نہ پانے پائے۔ ورنہ آپ کی مدت العمر کی محنت دنوں میں بگولے کی گرد بن کر اُڑ جائے گی۔ قرآنی تحریک کی نرم روی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا آغاز مکہ سے کیا، آج کی کثرت آبادی کی نسبت سے، اس زمانہ کا مکہ، بس یوں سمجھئے کہ جیسے ایک مختصر سا قصبہ، یہ آبادی اور حضور رسالتمآبؐ جیسے داعی انقلاب، آپ نے

عہدِ نبوت کا قریباً ساٹھ فی صد حصہ اسی شہر میں دعوت و تبلیغ میں صرف فرما دیا اور اس کا ماحصل قریب تین سو نفوس تھے۔ سوچیئے کہ کسی دعوت کی رفتار اس سے زیادہ سُست کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ اس دعوت کی سُست روی نہیں تھی بلکہ یہ خام لوہے کو پختہ بنانے کا عمل مسلسل تھا، اس کے برعکس ہمیں اپنی حالت پر غور کرنا چاہیئے، ساری دنیا کے مسلمان تو ایک طرف پاکستان کے مسلمانوں کو لیجیئے اور سوچیئے کہ ان کی تعلیم کتاب و حکمت کا اہتمام تو بہت دُور کی بات ہے کیا ہم ان سب تک قرآن کا پیغام پہنچا بھی سکے ہیں۔ جب ہماری منزلِ اوّل میں ہنوز یہ کیفیت ہے تو ہنگامہ آرائیوں کے تقاضوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ تھوڑا بہت اس وقت کر رہے ہیں اُسے بھی چھوڑ بیٹھیں۔

طلوع اسلام کی تحریک فکری تحریک ہے یہ شروع ہی سے فکری تھی اور جوں جوں ہنگامی تحریکوں کے تجربات سامنے آتے جاتے ہیں یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔ طلوع اسلام کی تحریک کو ہنگاموں اور شورشوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ قرآن کی رُو سے دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے نظامہائے حیات کو مٹایا نہ جائے لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا، جس میں جذبات کو مشتعل کر کے تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ فکری تحریک تجویز کرتا ہے، جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے "جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ خدا اس کے احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔" بعض حضرات یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں، نہ اُن کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کے لیے مکان، نہ علاج کے لیے چار پیسے، غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے کی آج ضرورت ہے اور اُن سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے، اُن کی اس بیتابیٔ تمنا کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزارہا تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ یہ حضرات اکثر چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھیئے انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اُن کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدت کو اُس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا، جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف

تھے وہ زمانہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ کا کہنا ہے کہ "نظریاتی تبدیلی کے لیے بڑے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے" انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے، قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں، اس لیے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لیے آمادہ کرنا ہوگا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب اس انقلاب کے لیے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہوتا ہے اس قسم کے صبر آزما اور طویل المیعاد پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لیے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات، تصورات اور اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہو کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا،

بزم ہائے طلوع اسلام کی شکل میں قرآنی فکر کو عام کرنے کی جو سعی و کوشش کی جا رہی ہے اس میں اس احتیاط کو سختی سے ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ اجتماعی کوشش کہیں پارٹی کا رنگ نہ اختیار کر جائے اس لیے اگر ایسا ہو گیا تو ہم اصل و بنیاد ہی کے خلاف چلے جائیں گے جس پر قرآنی فکر و نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ان زیرِ نقاب ناصحین کے دامِ ہم رنگِ زمین کا شکار ہونے سے بچیئے۔ جو ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کس طرح آپ کی تنظیمی کوشش میں پارٹی بازی کا رنگ پیدا کر سکیں۔ لہٰذا اس صورت اور احتیاط کے پیش نظر بزموں کے باہمی نظم و نسق اور ربط و ضبط کے متعلق کچھ ہدایات منضبط کر دی گئی ہیں۔ تاکہ ان سے مخلص رفقائے سفر کو راہ نمائی مل سکے۔ جو حضرات ان سے متفق ہوں وہ اپنے آپ کو بزم طلوع اسلام سے متمسک رکھیں جو یہ سمجھیں کہ اس میں ان کا دائرہ فکر و عمل تنگ ہو جائے گا وہ اپنی تگ و تاز کے لیے دوسرے میدان تجویز کر لیں۔ قرآنی فکر و عمل طلوع اسلام کی اجارہ داری نہیں جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جو لائحہ عمل اور طریق کار اپنے لئے مناسب سمجھیں اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص بزم طلوع اسلام سے وابستہ رہے اس کے لیے طلوع اسلام کی طرف سے نافذ کردہ ہدایات کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ صورت تو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتی کہ آپ ممبر تو بزم طلوع اسلام کے ہوں اور اپنے فکر و عمل میں طلوع اسلام کے مسلک و مقصد اور ہدایات و ضوابط کے الٹ چلیں اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ جو شخص آپ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے یکسر متفق نہ ہو اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی یہ تنظیم سیاسی جماعتوں کی تنظیم سے بالکل مختلف ہے۔ سیاسی جماعتوں کی تقویت کا راز ممبروں کی تعداد میں پوشیدہ ہوتا ہے وہاں ووٹ گنے جاتے ہیں، اور انہیں کے شمار سے پارٹی کا مقام

(باقی صفحہ 9 پر)

حقائق و عبر

۱- مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی

حال میں مسلم لیگ کے ایک بزرگ لیڈر سردار شوکت حیات نے بی۔ بی۔ سی کو انٹرویو دیتے ہوئے مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی کو ان الفاظ میں بے نقاب کیا:۔

"سردار شوکت حیات نے کہا مجھے ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے دوران حمایت حاصل کرنے کے لیے مولانا مودودی کے پاس بھی پیغام دے کر بھیجا۔ اور میں نے مولانا سے کہا کہ قائداعظمؒ نے کہا ہے کہ آپ ہمارے لیے "دوا" اور "دعا" بھی کریں جس پر مولانا مودودی نے لاحول ولا قوۃ..... کہتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے لیے دعا کیسے کر سکتا ہوں سردار شوکت حیات نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ آج یہ لوگ (جماعت اسلامی) پاکستان کے ترجمان بنے ہوئے ہیں یہ ایک المیہ ہے سردار شوکت حیات نے کہا کہ یہ بھی المیہ ہے کہ تحریک پاکستان کے وقت جو جذبہ تھا وہ برقرار نہیں رہا اور پاکستان بننے کے ساتھ ہی یہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔"

(روزنامہ نوائے وقت ۲۵ اگست ۸۷ صـ۳)

اس انکشاف پر جماعت اسلامی کے لیڈر پریشان ہوئے، انہوں نے اس میں الجھاؤ پیدا کرنے کیلئے سردار صاحب سے کئی سوال کئے جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

"آج ایک خصوصی ملاقات میں سردار شوکت حیات خان نے نائب امیر جماعت اسلامی چودھری رحمت الٰہی صاحب کے اس مطالبے کا جواب دیا کہ سردار صاحب مولانا مودودی کے ساتھ اپنی ملاقات کی جگہ بتائیں سردار صاحب نے بتایا کہ مولانا سے میری ملاقات ۱۹۴۵ء میں پٹھان کوٹ کے نیاز باغ میں ہوئی تھی میں نے ان کو قائداعظمؒ کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ تحریک پاکستان کی کامیابی کے لیے دعا کریں، مگر مولانا مودودی نے جواب دیا کہ میں مطالبۂ پاکستان کی حمایت کس طرح کر سکتا ہوں کیونکہ سارے ہندوستان کو مسلمان بنائے بغیر پاکستان کیسے قائم ہو سکتا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت ۲۹ اگست ۱۹۸۷ء صفحہ اول)

جماعت اسلامی والے اگر اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی پرانی فائلیں دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ مودودی صاحب نے کس طرح، قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی مثلاً جب جماعت اسلامی کے کچھ لوگوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دینے کی اجازت چاہی تو مودودی صاحب نے انہیں ووٹ دینے سے منع کر دیا۔

سوال اور مودودی صاحب کی زبانی اس کا جواب ملاحظہ ہو:-

سوال..... ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر، مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔ اور وہ اپنی قومی حکومت، قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا کردار اختیار کرنا چاہیئے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں یا خاموش بیٹھے رہیں یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟"

جواب..... اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جماعت کے اراکین کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا..... ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخاب کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بنا پر، ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۲۷ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۶ صفحات ۹۲، ۹۳)

دوسرے علماء نے بھی پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد، انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن جماعت اسلامی کے اخلاق کے کیا کہنے، کہ وہ تن من دھن سے قیام پاکستان کی مخالفت کرتی رہی اب وہ اپنے آپ کو پاکستان کا بانی قرار دیتی ہے!

ہم سمجھتے ہیں کہ سردار شوکت حیات کا یہ بیان حقیقت کے منافی ہے کیونکہ حضرت قائد اعظم رح سے (جو حصول پاکستان کو دینی فریضہ سمجھتے تھے) یہ بات بعید ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے دعا اور دوا کرنے کیلئے کہیں جو پاکستان کے نام سے چڑ رکھتا ہو اور حصول پاکستان کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت[1] (بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت) کا سبب سمجھتا ہو۔

۲- شاہکار رسالت

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ماہنامہ میثاق میں، اسلام میں حضرت علی رض کے مقام و مرتبے کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ شاہکار رسالت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ مطبوعہ آرمی پریس دہلی صفحہ ۱۳۲-۱۳۱

"غلام احمد پرویزؒ صاحب نے حضرت عمرؓ کی سیرت کا عنوان "شاہکارِ رسالت" رکھا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ لفظ حضرت علیؓ کی شخصیت کے لیے زیادہ موزوں ہے کیونکہ بالکل ابتدائی عمر سے ہی آپؓ کو حضورؐ کی تربیت میں پرورش پانے کا موقع ملا پھر ایمان لانے کے بعد سے ہجرت تک اور ہجرت کے بعد حضرت فاطمہؓ سے نکاح تک آپؓ حضورؐ کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور ستمبر ۸۷ صفحہ ۲۶)

محترم پرویزؒ صاحب کی بصیرت نے فاروق اعظمؓ ہی کو "شاہکار رسالت" جانا اور اس کی توجیہہ بھی انہوں نے اپنی اسی نام کی کتاب میں ان الفاظ میں دی ہے۔

"نبی اکرمؐ معلم۔ مربی اور مزکی تھے۔ یعنی آپؐ کا فریضہ یہ تھا کہ آپؐ اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے اپنے دست پروردگان کی صلاحیتوں کو ایسی جلا بخشیں جس سے وہ شرفِ انسانیت کے پیکر بن جائیں۔ ابوجہل، دستِ نبویؐ کی صورت گری کی سعادت سے محروم رہا تو اس کی صلاحیتیں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ وہ ناکامی کی زندگی جیا اور نامرادی کی موت مرگیا۔ (حضرت عمرؓ کو یہ سعادت نصیب ہو گئی تو اُن کی صلاحیتیں نشو و نما پا کر ایسے متوازن قالب میں ڈھل گئیں جس سے وہ نابغۂ روزگار بن گئے۔ تاریخ نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ دست پروردگانِ رسالتؐ میں، انہیں اس سعادت کا سب سے زیادہ حصّہ نصیب ہوا تھا۔ اس نہج سے دیکھئے تو حضرت عمرؓ کے کمالات، حضورؐ کی نگاہِ انتخاب اور سیرت سازی کے رہینِ کرم تھے۔ اسی اعتبار سے میری نگہِ بصیرت نے انہیں شاہکارِ رسالت کے لقب سے پکارا ہے ـــــ رسول اللہؐ شاہکارِ خالقِ فطرت اور فاروقِ اعظمؓ شاہکارِ رسالتؐ۔

پھر جس طرح نبی اکرمؐ کے خاتم الانبیاء اور مکملِ دینِ خداوندی ہونے سے، دیگر انبیاء کرامؑ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آجاتا، اسی طرح، فاروق اعظمؓ کے شاہکارِ رسالتؐ قرار پانے سے دیگر دست پروردگانِ رسالتؐ کے علو مرتبت میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہو جاتی۔ مقامِ صحابیت پر فائز ہونے کی جہت سے سب یکساں احترام و تکریم کے مستحق رہتے ہیں۔ "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" کا اعزاز خداوندی سب کے لئے ایک جیسا ہے۔

میں نے اسلام کو بحیثیت دین (نظامِ حیات) سیرتِ فاروقیؓ سے سمجھا تھا، اس لئے اس سیرت کو اجلی اور نکھری صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا اپنے ذمہ قرض محسوس کرتا تھا۔ للہ الحمد کہ میں آج اس قرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں"

مزید برآں طالبانِ حقیقت کے لیے، کم از کم، اس مایہ ناز تصنیف کا آخری باب "شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد" کا مطالعہ باعثِ علم و آگہی ہوگا۔

۳۔ شریعت بل یا دینِ اکبری

شریعت بل کے بارے میں مختلف فرقوں کے علما کے درمیان جو اختلافات تھے ان کی جھلکیاں طلوع اسلام میں وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اب مخالف فریقوں نے اس بل کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا ہے۔ دیوبندی فرقے کے ایک ممتاز عالم سید حامد میاں صاحب نے تو اسے بادشاہ اکبر کے دین الٰہی سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:۔

"ممکن ہے شریعت بل والوں کے ذہن میں یہ ہو کہ ہم چاروں اماموں میں سے جس کے بھی مسلک میں آسانی نظر آئے گی اختیار کر لیں گے۔ چاروں کی فقہوں کو سامنے رکھ کر ان میں سے آسان چیزیں لے کر جدید فقہ تیار کر لیں گے۔ لیکن ایسا کرنا سب آئمہ کے متبعین کے نزدیک جائز نہیں ہے علماء نے اس کا نام تلفیق رکھا ہے۔ یہ ممنوع ہے اگر آپ لوگوں کی خواہش یہ ہے تو اسے اتباعِ حق نہیں کہا جائے گا اسے اتباعِ ہوا..... کہا جائے گا اہل اہواء بدعتی شمار کیے گئے ہیں۔ آپ اس باطل اور غلط بنیاد پر جو عمارت بنائیں گے وہ غلط ہوگی اسے وہی علماء صحیح کہہ سکیں گے جو دین کو دنیا کے عوض بیچنے پر راضی ہوں۔

اگر مسلمانوں کو یہ سبز باغ دکھایا جائے کہ اس طرح کی شریعت آج کے تقاضوں پر پوری اُتر سکے گی تو یہ بھی خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ مسالک تو چاروں ہی پرانے ہیں اگر نئے دور تک کوئی مسلک حاوی ہو سکتا ہے تو وہ حنفی ہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب دین سے بھاگنے کی صورتیں ہیں نہ کہ دین پر عمل کی۔ اس طرح کی تدابیر سے جو معرض وجود میں آئے گا وہ چھوٹا دین اکبری ہوگا سود اور جوا جائز قرار دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ (ماہنامہ میثاق بابت ستمبر ۸۷ صـ ۴۱)

۴۔ فرقۂ اہل حدیث کے دھڑوں میں سر پھٹول

شریعت بل کی وجہ سے ہمارے ملک میں جتنے مذہبی فرقے موجود تھے، ان کے مزید دو دو دھڑے ہو چکے ہیں۔ ایک دھڑا شریعت بل کو اسلام قرار دیتا ہے اور دوسرا اُسے اسلام کے خلاف سازش کا نام دیتا ہے۔ پہلے ان کا یہ اختلاف زبانی تھا، اب انہوں نے ایک دوسرے کے سر پھاڑنے شروع کر دیئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں فرقہ اہل حدیث کے ایک دھڑے نے شریعت بل کی وجہ سے دوسرے دھڑے پر حملہ کر دیا۔ جس پر اس فرقے کے اُس دھڑے کے لیڈر نے یہ بیان جاری کیا ہے۔

مولانا معین الدین لکھوی امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان نے کہا ہے کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے ناظم سیاسیات اور بزرگ رہنما مولانا حکیم عبدالرحمن آزاد کے مکان پر حملہ اور گالم گلوچ انتہائی قابل مذمت اور تکلیف دہ حرکت ہے۔ آزاد صاحب نے تحقیقی انداز میں شریعت بل اور اس کے مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیا۔ اور انتہائی ذمہ دارانہ اور مثبت انداز میں اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

اہل حدیث یوتھ فورس کے ارکان نے دلائل سے اس کا جواب دینے کا حق استعمال کرنے کی بجائے ان کے مکان کے ساتھ ایک جلسہ رکھ کر انہیں غلیظ گالیاں دیں اور بعد میں ان کے مکان پر حملہ آور ہوئے۔

یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ اہلحدیث کا نام لینے والے بعض لڑکے سیدھی سادی غنڈہ گردی پر اتر آئے ہیں۔ انہوں نے وطیرہ بنا لیا ہے کہ دوسروں کے جلسوں میں گڑبڑ کی جائے۔ بزرگوں کی پگڑی اچھالی جائے۔ اور دلائل میں ناکامی کے بعد غنڈہ گردی، غلط بیانی اور سب وشتم سے اپنی

بات منوانے کی کوشش کی جائے۔ ہم نے اب تک ہمیشہ ان کی حرکتوں کو نظر انداز کیا۔ ہمیں امید تھی کہ یہ لوگ اپنی اوچھی حرکتوں پر خود شرمندہ ہوں گے، لیکن اس سے ان کی حرکتوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ چند دن پہلے انہوں نے ٹھینگ موڑ میں بھی متحدہ شریعت محاذ کے پُرامن جلسہ پر اسی طرح کی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا تھا اب ایک ایسے بزرگ کے گھر پر حملہ کیا جو عمر میں ان سے تین گنا بڑے ہیں۔ اگر حکیم صاحب اس موقع پر شبان اہلحدیث کے کارکنوں کو نہ روکے رکھتے تو ان غنڈوں کو اچھا سبق مل جاتا لیکن انہوں نے مرکزی جمعیت اہلحدیث کی طے شدہ پالیسی

کے مطابق نوجوانوں کو ردِ عمل کا اظہار نہ کرنے دیا۔"

(ہفت روزہ اہل حدیث لاہور صد ا ۸۰)

پہلے فرقہ اہل حدیث حنفیوں سے لڑا کرتا تھا۔ اب اس نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔

۵- لاؤڈ سپیکر۔ فساد کا بہت بڑا سبب

جب لاوڈ سپیکر کا پہلے پہل ہمارے معاشرے میں استعمال شروع ہوا۔ تو علماء نے یہ فتوی دیا کہ اس میں شیطان بولتا ہے اس لیے اس کا استعمال حرام ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقبل کتاب لکھی۔ لیکن بعد میں مولوی حضرات کو اس کا ایسا چسکا پڑا کہ کوئی چھوٹے درجے کا مولوی بھی لاوڈ سپیکر کے بغیر تقریر نہیں کرتا۔ بعض علاقوں میں تو یہ لاوڈ سپیکر اہل محلہ کے لیے عذابِ جان بن چکے ہیں۔ علامہ پرویزؒ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولوی ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ اس میں شیطان بولتا ہے۔ کیونکہ وہ خود اس کے ذریعے مسلمانوں کے لڑانے کا مشغلہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس وقت علماء حضرات نے پرویزؒ صاحب کے ان الفاظ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا لیکن اب انہوں نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ یہ مسلمانوں میں فساد کی جڑ ہے۔ ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث اپنی ۲۸ اگست ۱۹۸۷ کی اشاعت میں صفحہ ۴ پر "لاوڈ سپیکر کے غلط استعمال کا سدِ باب بھی نہایت ضروری ہے" کے تحت لکھا ہے:۔

> اسسٹنٹ کمشنر صدر اقبال احمد بوسن نے شہریوں سے کہا ہے کہ وہ محرم کے دوران باہمی اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرپسند عناصر کی جانب سے امن وامان کی صورتحال کو ناکام کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیں۔
>
> دریں اثناء ضلعی انتظامیہ نے تنبیہ کی ہے کہ محرم الحرام کے دوران لاوڈ اسپیکر کے غیر قانونی استعمال میں ملوث ہونے اور اسلحہ لے کر چلنے والے افراد کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔
>
> ("جنگ" لاہور۔ ۱۲ اگست)

خدا کرے کہ انتظامیہ اپنی تنبیہات کے مطابق عمل درآمد کا اہتمام بھی کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ لاوڈ سپیکر کا غلط استعمال بھی فساد کا بہت بڑا سبب ہے کہ بالخصوص شیعہ ذاکروں کی تقریریں سخت اشتعال انگیز ہوتی ہیں، اس لیے ہماری تجویز ہے کہ شیعوں کی مجالس و محافل عزاء میں لاوڈ سپیکر کے استعمال کے لیے یہ پابندی نہایت ضروری ہے کہ اس کی آواز مجلس کی مخصوص جگہ سے باہر اہل محلہ تک نہ پہنچے۔ اگر حکومت یہ اہتمام سختی سے کرا سکے تو فساد کے ایک بہت بڑے

(باقی صد ۹ پر)

باب المراسلات

برما کے مظلوم مسلمان اور عالم اسلام کی ذمہ داری

کراچی سے محترم سیف اللہ خالد صاحب نے ہمیں ذیل کا مراسلہ بھیجا ہے جسے من وعن شائع کیا جاتا ہے۔

آزاد مسلم حکومتوں کے ارباب اختیار سے گذارش ہے کہ برما کی بدھ سوشلسٹ حکومت سے جہاں تجارتی معاملات کے مذاکرات ہوں وہاں برما کے مسلمانوں کے حقوق کی بات بھی ضرور کی جائے۔ یہ بات کسی بھی مسلم ملک کے لیے غیر متعلق نہیں ہوگی، اگر تامل مسئلہ پر بھارت سری لنکا کے خلاف جارحانہ فوجی مداخلت کر سکتا ہے اور تامل باشندوں کی اسلحہ اور دیگر مادی وسائل کے ساتھ کھلم کھلا امداد کر سکتا ہے۔ اگر سوشلسٹ روس اپنے اشتراکی ساتھیوں کے لیے تڑپ اٹھتا ہے تو مسلمان زیادہ حقدار ہیں کہ اپنے اہل ایمان بھائیوں کے دکھ تکلیف پر سراپا اضطراب بن جائیں۔

برما کے روہنگیا مسلمانوں کے اصل حالات سے دنیا کو تھوڑی سی واقفیت اس وقت ہوئی جب ۱۹۷۸ء میں اراکان کے مسلمان جوق در جوق بنگلہ دیش پہنچنا شروع ہوئے۔ برما کے آہنی اشتراکی نظام کی وجہ سے اس کے اندر کی کوئی خبر باہر کی دنیا تک کم ہی پہنچ سکتی ہے۔ ۱۹۷۸ء کے بعد اراکان کے مسلمانوں نے ایک متحدہ تنظیم قائم کی جس کا نام "روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن" ہے۔ مسلمانوں کے حالات کے بارے میں یہی تنظیم بیرونی دنیا کو خبریں پہنچاتی ہے۔

روہنگیا، اراکانی مسلمانوں کا قومی نام ہے۔ روہنگیا مسلمان، عرب، ایرانی، پٹھان، مغل اور مقامی باشندوں کی نسل سے ہے۔ عرب تجارت کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اراکان میں ان کی کوششوں سے اسلام کی روشنی پھیلی اور بہت سے مقامی باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ پندرھویں صدی عیسوی تک اسلام اکثریت کا دین بن گیا۔ اور ۱۴۳۰ء میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت وجود میں آگئی جو ساڑھے تین سو سال تک قائم و دائم رہی۔

پھر اس سلطنت و حکومت پر ۱۷۸۴ء میں برمیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۸۲۴ء میں برمیوں سے یہ علاقہ انگریزوں نے چھین لیا اور ۱۹۴۸ء تک وہ اس پر حکومت کرتے رہے اور جاتے ہوئے اسے آزاد برما میں

شامل کر گئے۔

تب سے برما کے مسلمان انتہائی نازک حالات سے دوچار ہیں۔ ان کے سامنے اب دو ہی راستے رہ گئے ہیں یا تو وہ برما چھوڑ دیں یا پھر لادین بدھ اشتراکی معاشرے میں گم ہو جائیں۔ بحیثیت مسلمان آبرو مندانہ زندگی بسر کرنے کا اب کوئی راستہ اُن کے لیے باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ جیسا کہ ہر قوم پرست ریاست کا ہدف ہے کہ اپنی حدود کے اندر تمام باشندگان کو ایک قومی سانچے میں ڈھال دیا جائے، وہ ایک یکساں اور یک رنگ معاشرہ بن جائیں اور تمام مذہبی و ثقافتی امتیازات ختم ہو کر رہ جائیں ـــــ اور اشتراکی ریاستیں تو اس جنون میں قومی ریاستوں سے بھی کئی ہاتھ آگے ہیں، چنانچہ برما اس کی بدترین مثال ہے جہاں قوم پرستی اور اشتراکیت دونوں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔

"برمیز" یا "برمن" یہاں کی حکمران نسل کا نام ہے۔ پوری تاریخ میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ تمام انسانی و مذہبی اقلیتوں کو ختم کر کے انہیں خود میں مدغم کر لیا جائے اور اقلیتوں کا انفرادی وجود مٹا دیا جائے۔ اس حکمت عملی پر وہ مختلف طریقوں سے عمل پیرا ہیں۔ انہوں نے اس طریق کار کو ۱۹۶۲ء سے جنرل "نی ون" کی فوجی قیادت میں سوشلزم کی صورت میں مزید مؤثر انداز میں ڈھال لیا ہے۔

اسلام کی اپنی تہذیب، اپنا تمدن اور طرزِ زندگی ہے۔ برمیوں کو اس سے خطرہ ہے اور وہ اسے اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ طریق کار اپنایا کہ بہر صورت مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی سے دُور کر دیا جائے۔ برما کے اندرونی علاقوں میں رہنے والے مسلمان چونکہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں اس لیے وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس سازش کا شکار ہو گئے۔ لیکن اراکان میں چونکہ وہ اکثریت میں تھے، ان کی تعداد آستی فیصد سے زیادہ تھی، آبادیاں یکجا تھیں اور وہ ایک برتر دین اور تہذیب و تمدن کے مالک ہونے کی وجہ سے برما میں ایک اقلیت کے طور پر نمایاں تھے۔ اس لئے اُن کو برمی تہذیب و تمدن میں ڈھالنے کی پالیسی یہاں پر بے اثر رہی۔ اس کے جواب میں انہوں نے مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر تشدد کا نشانہ بنا لیا اور انہیں معاشی طور پر بدحال اور تعلیمی میدان میں پسماندہ رکھنے کی سازش تیار کر کے اس پر عمل شروع کر دیا تاکہ روہنگیا مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں۔

یہ داستانِ درد بڑی ہی لرزہ خیز ہے۔ ان مسلمانوں کو ان کی اپنی ہی سرزمین سے ختم کر دینے یا نکال باہر کرنے کے لیے انتہائی منظم کوشش نہایت ہی تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

روہنگیا مسلمانوں پر اب تک لاتعداد فوجی آپریشنز ہو چکے ہیں، جن میں سے گیارہ آپریشنز تو

اپنی ہولناکی کی وجہ سے پورے برما میں مشہور اور زبانِ زدِ خاص و عام ہیں۔ اگرچہ بیرونی دنیا اُن سے کما حقہٗ، واقف نہیں ہے۔ اِن آپریشنز میں ہزاروں مسلمان تہ تیغ اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ اِن میں سے شدید ترین فوجی آپریشن ۱۹۷۸ء میں "آپریشن ناگا من" کے نام سے ہوا تھا۔ "ناگا من" کا مفہوم ہے "ناگ بادشاہ" عنوان کے عین مطابق برمی ناگ نے مسلمانوں کو نگلنے کے لیے پھن اٹھایا تھا۔ برمی فوج اور بُدھ غنڈوں نے مسلمانوں پر ایک منصوبے کے تحت حملے شروع کر دیے۔ ایک شہری کو ظلم سے حکومت پناہ دیتی ہے، لیکن جب حکومت ہی آمادۂ ظلم ہو جائے تو اس کو کہاں سے پناہ مل سکتی ہے؟ جب مسلم بستیوں پر چاروں جانب سے حملے ہونے لگے تو وہ پڑوسی ملک بنگلہ دیش میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ مسلمان پناہ گزینوں کی یہ تعداد دیکھتے ہی دیکھتے تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ بنگلہ دیش جس کے لیے اپنا پیٹ پالنا مشکل تھا، وہ ان مہاجرین کا بار کیسے اٹھا سکتا تھا، حکومت بنگلہ دیش نے برما سے آنے والے اس ناگہانی سیلاب پر احتجاج کیا تو عالمی دباؤ پیدا ہوا جس پر برمی حکومت بنگلہ دیش حکومت سے آمادہ مذاکرات ہو گئی ان مذاکرات کے نتیجے میں حکومت برما نے مسلمان مہاجرین کو واپس آنے کی دعوت دی۔ لیکن مسلمان جب واپس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ حالات ویسے ہی حوصلہ شکن تھے جیسے ہجرت سے پہلے۔ چونکہ ان کا برادر مسلم ملک بنگلہ دیش بھی اُن کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا اس لیے ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ برما کے جہنم کو قبول کر لیں۔

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن اراکان (برما) کے صدر مولانا سیف الاسلام صاحب نے اپنے تازہ جاری کردہ اعلامیہ اور اپیل میں کہا ہے کہ اب پھر ۱۹۸۷ء میں ایسے آثار ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف عنقریب کوئی بہت بڑا حملہ ہوگا۔ انہوں نے مذکورہ اپیل میں اپنے اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ اب کی مرتبہ ایسا ہوا تو روہنگیا مسلمان نہ اپنا ملک چھوڑیں گے اور نہ خاموشی سے ظلم و ستم برداشت کریں گے بلکہ وہ ہر ظلم و جبر اور چیرہ دستی کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔ اگرچہ وہ نہتے ہیں لیکن خالی ہاتھوں ہی دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گے اور ذلت و رسوائی کی زندگی کی بجائے عزت اور شہادت کی موت کو ترجیح دیں گے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نصف صد کے قریب آزاد مسلم ریاستوں کے حکمران اور عوام اور بے شمار مسلم تنظیمیں بھی ان بے بس و بے قصور مسلمانوں کی کسی مدد کو پہنچیں گی؟ یا انہیں حسبِ سابق مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیں گی؟

جی ہاں! آج کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے۔

حسن عباس رضوی

غیر مسلم بھی شریعت کورٹ کا جج بن سکتا ہے

ڈاکٹر اسرار احمد کا فتویٰ

ڈاکٹر اسرار احمد صدر مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، رجسٹرڈ، ایم۔ بی بی ایس (پنجاب)، ایم۔ اے اسلامیات (کراچی) کے ایک انٹرویو کی رپورٹ ...... روزنامہ جنگ لاہور کے جمعہ میگزین ۱۴۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی جس میں ایک سوال کے جواب میں شریعت کورٹ میں کسی غیر مسلم جج کی شمولیت کے بارے میں انہوں نے کہا :۔

"شریعت کنونشن میں میاں طفیل محمد کی تقریر میں مثالیں دی گئی تھیں کہ دیکھئے انگریز کے دور میں پرسنل لاء کے بہت سے معاملات عدالتیں اسلامی فقہ کے مطابق طے کرتی تھیں اور ان عدالتوں میں فیصلے ہندو جج کرتے تھے۔ جج کوئی بھی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی عالم دین کو جج بنانا لازمی نہیں ہے۔ ہمیشہ عدالت میں دو وکیل کھڑے ہوتے ہیں، وہ بال کی کھال اتار کر بتا دیتے ہیں کہ قرآن میں کیا ہے اور حدیث میں کیا ہے ـــ

ہم تو اس معاملہ میں یہ کہتے ہیں کہ ایک عدالت بنائی جائے خواہ جج غیر مسلم ہی ہو۔

جنگ ..... کیا غیر مسلم بھی اس کا جج بن سکتا ہے ؟

ڈاکٹر اسرار احمد ..... بن سکتا ہے ..... جسٹس کارنیلیس بھی بتا سکتے ہیں، فلاں چیز اسلامی شریعت کے مطابق ہے اور فلاں چیز نہیں۔ کوئی بھی آدمی جو ایکسپرٹ ہو یہ بتا سکتا ہے کہ امریکی آئین کے مطابق کون سی بات غلط ہے، کون سی صحیح ہے۔ تو اس طریقہ سے کتاب و سنت کی کوئی گنجلک چیز نہیں ہے۔ اللہ کی کتاب ہے، رسول کی سنت ہے اور تیرہ سو سال تک یہ نظام چلتا رہا ہے۔

اس حصہ انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب نے شریعت کورٹ کی تشکیل کے بارے میں کہا ہے :۔

۱۔ غیر مسلم بھی شریعت کورٹ کا جج بن سکتا ہے۔

۲۔ غیر مسلم جج کی COMPETENCE کے بارے میں جسٹس کارنیلیس (جو عیسائی ہیں) کی مثال دی ہے کہ وہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فلاں چیز اسلامی شریعت کے مطابق ہے۔ فلاں چیز نہیں۔

۳۔ میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی کے حوالہ سے کہا کہ انگریز کے دور میں پرسنل لاء کے بہت سے معاملات کے فیصلے عدالتیں اسلامی فقہ کے مطابق کرتی تھیں اور ان عدالتوں میں فیصلے ہندو جج کرتے تھے۔

۴۔ تائید میں امریکی آئین کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ کوئی بھی آدمی جو ایکسپرٹ ہے، بتا سکتا ہے کہ امریکی آئین کے مطابق کونسی بات

غلط ہے اور کونسی صحیح۔

قارئینِ کرام دیکھیں گے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نظریے کی تائید میں قرآنِ حکیم سے کوئی سند پیش نہیں کی۔ اور اگر کوئی شہادت پیش کی تو وہ بھی غیر منقسم ہندوستان کی ہندو عدالتوں کی اور امریکی آئین کی۔

پیشتر اس کے کہ زیرِ نظر مسئلہ کے بارے میں کچھ کہا جائے، ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شریعت کسے کہتے ہیں۔ شریعت آئینِ حکومتِ خداوندی کا نام ہے۔ یہ شریعت قرآنِ حکیم میں ہے اس لیے کہ قرآن کے سوا کسی اور آئین کی اطاعت جائز نہیں۔ اس شریعت کا پیغام کوئی نیا نہیں تھا بلکہ وہی پیغام تھا جو اُس وقت سے دُنیا کے سامنے آتا رہا جس وقت سے دنیائے فکر و عمل کو رشد و ہدایت کی ضرورت ہوئی۔ وہی پیغام جو حضرت عیسیٰؑ تک مختلف ادوار، اعصار اور متعدد دیار و امصار میں دہرایا جاتا رہا۔ وہی پیغام جس کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۴/۱۶۳

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوحؑ پر اور اُن نبیوں پر جو نوحؑ کے بعد ہوئے تھے) اور جس طرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اولادِ یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ پر بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی۔

اس وحی کی غائت کیا تھی؟ "قیامِ دین" اُس نظامِ زندگی کا قیام جس میں انسانیت اپنے مقصود تک جا پہنچے اسی کا نام شریعت ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۴۲/۱۳

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) خدا نے تمہارے لیے وہ نظامِ زندگی تجویز کیا ہے (جو کوئی نیا نظام نہیں ہے بلکہ اب سے بہت پہلے) جس کی نوحؑ کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے اور جس کی (اے پیغمبرِ ختمی مرتبت!) اب ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور (تم سے پہلے اسی نظام کو قائم کرنے کی) ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو بھی ہدایت فرمائی ہے۔ (وہ ہدایت کیا ہے؟) یہی کہ (وحی کے متعین فرمودہ) نظامِ زندگی کو قائم کرو (پھر یکدلی سے اس پر جم جاؤ یعنی) اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرو اور نہ ہی متفرق راہیں اختیار کرو۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۴۲/۱۳

(اے پیغمبرؐ!) مشرکین پر اس نظامِ زندگی کا قیام جس طرف تم انہیں بلا رہے ہو، بڑا ہی گراں گزر رہا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنِ حکیم کے بیان کے مطابق شریعت، آئین، حکومتِ خداوندی کا نام ہے، یہ شریعت، احکامات و قوانینِ خداوندی ہیں جو اپنی آخری اور منزّہ شکل میں قرآنِ حکیم کی دو فتین میں محفوظ ہیں اور جن کے علاوہ کسی اور آئین کا اتباع اور اطاعت جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جو کچھ اپنے بندوں کو کہنا تھا نبیٔ آخر الزماں کی وساطت سے بذریعہ وحی آخری مرتبہ کہہ دیا۔ انسانوں کی نجات کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے قرآن کے علاوہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی، اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اُس ذاتِ اطہر و اقدس کے نقوشِ پا جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بحق دِل بندو راہِ مُصطفٰے رو

شریعت کے بارے میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ قرآنِ حکیم میں ماسوائے چند جزئیات کے اکثر اصول دیئے گئے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ اِن اصولی قوانین و ہدایات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے جزئی احکام (BYLAWS) متعین کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہ احتیاط رہے گی کہ جزئی قوانین (BYLAWS) قرآنِ حکیم کے احکامات سے متصادم نہ ہوں اور کسی حالت میں بھی نظامِ حیات میں ان سے (DEPARTURE) نہیں کیا جائے گا۔ ہاں البتہ جزئی قوانین جنہیں شریعت کہا جانے لگا ہے، زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ لیکن قرآنِ حکیم کے اصول اور احکامات ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گے۔ شریعت کورٹ بھی اس دائرۂ عمل سے باہر نہیں رہے گی، خواہ اُس کی تشکیل ہو یا اُس کے فیصلے۔

برادرانِ عزیز! معاملہ چونکہ پاکستان اور پاکستان کے اندر شریعت کورٹ سے متعلق ہے، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ دیکھتے چلیں کہ پاکستان کے مطالبے اور اس کے معرضِ وجود میں آنے کا مقصد کیا تھا۔ اس سلسلے میں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۸ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کے طلبا کے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی حکومت کے تصوّر کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، فرمایا:۔

"اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پاکستان میں ضابطۂ حیات کے بارے میں آپ نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں فرمایا:-

"اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآنِ حکیم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے، جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لیے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان، قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔" (تقاریر جلد دوم صفحہ ۳۰)

یہ تھا خلاصہ مطالبۂ پاکستان کا اور تعارف اُس غیر متبدل اور جامع ضابطۂ حیات کا جسے مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے لیے سرچشمۂ قوانین و ہدایات قرار دیا جانا مقصود تھا۔ یعنی القرآن الحکیم !!

اب آیئے اصل مسئلہ کی طرف، چونکہ اسلامی مملکتِ پاکستان کا وجود نظامِ خداوندی کے قیام اور قرآنی احکامات و قوانین کے نفاذ کے لیے عمل میں آیا تھا اس لیے ظاہر ہے جو لوگ اس آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) کو تسلیم نہ کریں یعنی (غیر مسلم)، اُنہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی کلیدی اسامی پر تعینات کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا واضح فیصلہ ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ

"اے جماعتِ مؤمنین! مؤمنین کے علاوہ غیر مؤمنوں کو اپنا راز دان نہ بنانا"

وجہ یہ بتائی کہ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا (۳/۱۱۸) "غیر مومن تمہاری بربادی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے"

پھر کہا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (۴/۱۴۴)

اے جماعتِ مؤمنین! مؤمنین کے علاوہ غیر مؤمنوں کو نہ ہی تو اپنا شریکِ کار (رازداں) بنانا اور نہ ہی شریکِ حکم:-

أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا (۴/۱۴۴)

"کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اُوپر خدا کا صریح الزام لے لو جو تمہیں سزا کا مستوجب قرار دیدے"

یہاں تک کہ اگر اپنے قریبی رشتہ دار بھی کفر پسند کریں تو اُن سے بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں، خواہ وہ ماں باپ اور بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹/۲۳)

"اے اہلِ ایمان! اگر تمہارے (ماں) باپ اور (بہن) بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں

تو اُن سے دوستی نہ رکھو۔ اور جو اُن سے دوستی رکھیں گے وہ ظالم ہیں۔ گویا یہ سب نہ تو تمہارے شریکِ کار ہو سکتے ہیں نہ شریکِ راز۔"

تصریحاتِ بالا کی رُو سے اسلامی نظام کے اندر، کوئی بھی شعبہ ہو، غیر مسلم نہ تو شریکِ راز ہو سکتے ہیں اور نہ شریکِ کار اور شریکِ حکم اور نہ ہی اُنہیں کسی کلیدی اسامی پر تعینات کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنا خدا کے حکم کی خلاف ورزی ہو گی اور نظریۂ پاکستان کی تضحیک!

برادرانِ عزیز! اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ جذباتی نہیں بلکہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم نے ابھی تک اصول کی بات کی ہے، اُس کی عملی شہادت کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے لیے ہم بارگاہِ الٰہی سے پوچھتے ہیں تو جواب آتا ہے کہ

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۲۴/۳۴

"ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے ہیں اور اُن کی تائید و وضاحت کے سلسلہ میں اقوامِ سابقہ کی تاریخی شہادتیں بھی بتا دی ہیں جن کے اندر اُن لوگوں کے لیے جو زندگی کی کوتاہیوں سے بچنا چاہیں درسِ عبرت ہے۔"

آپ جانتے ہی ہیں کہ قرآنِ حکیم میں قوانین و احکامات کی تائید و شہادت میں کس قدر واقعات ہیں جو تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں تاکہ قوانین و احکامات کی کُنہ و حقیقت اور حکمت، کُھل کر سامنے آجائے اور مجملِ امور کے علاوہ یہ سمجھنے میں بھی آسانی ہو جائے کہ جن قوموں نے ضابطۂ خداوندی کو امام بنایا اور اُس کے مطابق زندگی اختیار کی، وہ کس قدر کامیاب و کامران ہوئیں اور جنہوں نے اسکا تمسخر اُڑایا اور اُس کے مطابق عمل نہ کیا وہ ذلیل و خوار ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی ہوا اس طرح اُکھڑ گئی کہ پھر وہ کبھی بھی نہیں سنبھل نہ سکیں اور تاریخ کے صفحات پر فقط اُن کی داستاں باقی رہ گئی۔ یہ تو تھا نزولِ قرآن اور تکمیلِ قرآن سے پہلے ادوار کا سلسلہ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون تو اپنی ہمہ گیر خوبیوں اور ماضی کی تاریخی شہادتوں کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن مستقبل کے لیے شہادتی امور میں قرآنِ حکیم ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد ہوا:-

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ۴۱/۵۳

ہم اپنی آیات (نشانیاں) عالمِ آفاق اور عالمِ انفس دونوں میں دکھاتے چلے جائیں گے حتّٰی کہ یہ بات ناقابلِ انکار کر سامنے آجائے کہ قرآن حق ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا تیرے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تیری ذات

اب ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا پاکستان کی تاریخ میں کوئی ایسی شہادت ملتی ہے جو یہ ثابت کرے کہ واقعی غیر مسلم اسلامی نظام کے اندر نہ تو شریکِ راز اور شریکِ محکم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کلیدی اسامی پر فائز۔ اس ضمن میں بہت

واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن سرِ دست دو شہادتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

پہلی شہادت :- پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی میں کانگرسی لیڈر مسٹر چٹو پادیا اپوزیشن کے لیڈر تھے۔ جب ڈھاکہ میں قانون سازی کا کام شروع ہوا تو تمام کانگرسی غیر مسلم اور ہندو مہا سبھا کے اراکین، اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایوان سے باہر جانے لگے۔ اس پر مرحوم سردار عبدالرب نشتر نے اُنہیں روکا اور کاروبارِ اسمبلی میں حصّہ لینے کی درخواست کی۔ آپ حیران ہوں گے کہ مسٹر چٹو پادیا نے کیا جواب دیا۔ اُنہوں نے سردار صاحب سے کہا کہ آپ قرآن و سُنّت کے مطابق قانون سازی کا کام کر رہے ہیں اور ہم اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیئے ہم آپ کی کاروائی میں کیسے حصّہ لے سکتے ہیں اور آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ اس طرح اپوزیشن والے (کانگرسی غیر مسلم اور ہندو مہا سبھائی ممبران) EN-BLOCK ایوان سے باہر چلے گئے۔ جو بات ہم اُنہیں نہ کہہ سکے وہ بات اُنہوں نے ہمارے منہ پر دے ماری۔

دوسری شہادت :- پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے پر جو پہلی کابینہ بنی، اُس میں جوگندر ناتھ منڈل کو جو کہ اچھوت (غیر مسلم) لیڈر تھے وزارت میں رکھا گیا۔ اس سے قبل بھی، پاکستان بننے سے فوراً پہلے، ہندوستان میں جو کانگرس اور مسلم لیگ کی مشترکہ وزارت بنی تھی، اُس میں بھی ان کو مسلم لیگ کے کوٹہ کی پانچ سیٹوں میں سے ایک سیٹ پر وزیر بنایا گیا تھا۔ بہر حال پاکستان میں منڈل صاحب بطور وزیر کام کرتے رہے اور ایک دن آیا کہ منڈل صاحب تمام متعلقہ ریکارڈ لے کر ہندوستان بھاگ گئے۔ یہ تھا ڈراپ سین اُس ذمہ داری کا جو ایک غیر مسلم کو سونپی گئی۔ ایسے ہی حوادث کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم نے کہا تھا اور CATEGORICALLY کہا تھا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں کو اپنا راز داں اور شریکِ کار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہاری بربادی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

تصریحاتِ بالا سے صاف ظاہر ہے قرآنِ حکیم کی رو سے غیر مسلموں کو جو اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہیں کرتے، اسلامی نظام کے اندر اُمورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ (بقول ڈاکٹر اسرار احمد) ایک غیر مسلم، شریعت کورٹ کا جج ہو سکتا ہے، جو کہ نصِ قرآنی کے صریحاً خلاف ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

نمائندہ بزم طلوعِ اسلام
کوپن ہیگن۔ ڈنمارک

کاغذ کی ناؤ۔ بارش کا پانی

محترم محمد اسلم رانا صاحب بزم طلوعِ اسلام کوپن ہیگن، ڈنمارک کے نمائندہ اور ماہنامہ جریدہ البلاغ کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اپنے رشحاتِ قلم بغرضِ اشاعت، ارسال کئے ہیں۔ جنہیں بصد شکریہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ملت پاکستانیہ نے اپنا اکتالیسواں یومِ آزادی بڑی ہی خاموشی اور بیچارگی سے گذارا۔ آزادی خوش حالی کی ضامن ہوتی ہے بشرطیکہ عوام الناس آزادی کے مفہوم سے کُلّی آشنائی رکھتے ہوں اور اس قسم کی آشنائی کے لیے "دین" جو کہ مکمل ضابطۂ حیات ہے کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں کی نگرانی میں تعلیم جیسے انمول زیور کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان چالیس برسوں میں ملک و قوم کے خادم اور محافظ حاکم تو بن گئے (حالانکہ حاکم ہونے کا حق صرف خدا کو ہے۔ ۱۲/۴) مگر خود ہی اس انمول زیور سے محروم ہوتے ہوئے امت کو اس گوہر سے مزین کرنے میں نہایت بُری طرح ناکام رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی حاکمیت کو مستحکم رکھنے کے لیے قوم کو بتائے ہوئے اصولوں کے تحت اجتماعی حیثیت میں آنے ہی نہ دیا۔ اور..... یہ سلسلہ انفرادیت کا شکار ہو گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیشوائیت مذہب کا خوف طاری کر کے فرد کو ذاتی نجات اور بخشش کا جھانسہ دے کر دبوچ لیتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔

اب حالت یہ ہے کہ طورخم کے سنگلاخ پہاڑوں سے کیماڑی اور منوڑہ کے ساحلوں تک نرسری سے میٹرک ایف اے، بی اے، ایم اے اور دیگر فنی مضامین کے لئے ٹیوشن کے بورڈ ہر مکان، کوٹھی اور جھگی پر آویزاں نظر آئیں گے اس کے علاوہ یہ روش کہ، ہمارے بچے غیر ملکی معیار کے مطابق تعلیم حاصل کریں، وباء کی طرح عام ہو رہی ہے۔ اور اس خواہش کی تکمیل کی خاطر لوگ جوق در جوق CONVENTS کا رُخ کر رہے ہیں جس کی بدولت وہاں کی فہرستِ انتظار اتنی طویل ہوتی جا رہی ہے کہ اگر دیانت داری سے اپنی باری کا انتظار کیا جائے تو بچہ عالمِ بلوغت کو پہنچ چکا ہو گا۔ اس نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے نااہل، جاہل اور بے خبر لوگ دولت

سمیٹنے کی خاطر سکول پہ سکول کھولے جا رہے ہیں۔ غیر ملکی معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ سکول کی عمارت کی پیشانی پر جلی حروف میں "فارن سٹاف کی نگرانی میں" چسپاں کرنا نہیں بھولتے۔ لیکن عیسائی نام غیر ملکی معیار کا ضامن تصور کرتے ہوئے کچھ لوگ سینٹ رابرٹ، سینٹ تھامس جیسے سکول کھول رہے ہیں اور یہ کہ سینٹ جوزف مسلم سکول جیسے نام پیش کے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ جمعیت علماء اور وقتی حاکموں کے سامنے ہو رہا ہے اور ستم پہ ستم اس بدنظمی اور انتشار کے عالم میں مذہب کے بخار میں مبتلا حاکم اور دو رکعت کے امام باہمی گٹھ جوڑ سے شریعت بل کے نفاذ کے درپے ہیں۔ اس کی کسی کو نہ تو پرواہ ہے اور نہ ہی علم کے قوانین کا احترام ہو رہا ہے

قرآن بتاتا ہے اے انسان خارجی کائنات کی قوتیں تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ، ان سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے بھی استعمال میں لاؤ۔ لیکن ان مسخر کی گئی قوتوں کو استعمال میں لانے کے لیے علم کا مکمل ادراک اور آگہی کا ہونا ضروری ہے جس کے لیے معاشرے پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دیانت داری سے صحت مند ماحول میں علم کے حصول کے لیے قومی جذبے کے تحت درس گاہیں، جو پوری سہولتوں سے مرصع ہوں، مہیا کرے اور ایسے معلم متعین کرے جو طلبا کو جب نصابی مضامین کا درس دیں تو مطالب و معانی کے علاوہ علم الوسعت کے طور و اطوار بخوبی سمجھانے میں پوری مہارت کے حامل ہوں۔ تاکہ طلباء کو باور کرا سکیں کہ ان کی منزل حروف کی جان پہچان ہی نہیں بلکہ انہیں دائرہ آفاق کو چھونا ہوگا۔ کیونکہ "الفاظ تو برف کی طرح سرد ہوتے ہیں۔ جنہیں دھوپ کی گرمی زندگی بخشتی ہے" الفاظ سے کھیلنا بھی عجیب مشغلہ ہے۔ اسی مشغلے کے دوران الفاظ مختلف اشکال میں ترتیب پاتے حقیقت میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں جو جھلملاتے ستاروں کی طرح جگمگاتے نظر آنے لگتے ہیں۔

کاغذ پہ حروف جاگیں، لکھوں ایسے شعر میں مجھ کو ہو اک بیاں پہ قدرت کمال ہو (شبنم)

لیکن ہمارے نظامِ تعلیم کا طریق کار صرف اور صرف حروف کی پہچان تک محدود اور مقید ہو کر رہ چکا ہوا ہے جس کا نتیجہ صرف افسوسناک ہی نہیں بلکہ المناک ہے کیوں جتنے بھی انجینئرنگ کی درس گاہوں سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں ایک کلرک سے زیادہ کی اہلیت کے حامل ثابت نہیں ہو سکے۔ پورے وطن عزیز کی سڑکیں، گلیاں اور عمارتیں ان کی نااہلی کی عکاسی کر رہی ہیں۔ ملک میں ڈیم، پل اور سڑکیں تیار کرنے کے لیے یورپی ممالک سے باصلاحیت اور اہلیت کے حامل لوگ ہماری استطاعت سے کہیں زیادہ معاوضہ پر بلائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ قومی سرمایہ کو ذاتی ملکیت تصور کرتے ہوئے قومی املاک کوڑیوں کے مول فروخت کر دیتے ہیں۔ یعنی ۳۶ لاکھ روپیہ میں خریدا گیا ایک بُل ڈوزر پونے دو لاکھ میں فروخت ہو جاتا ہے۔ یہ نااہلی اور خود غرضی کی انتہا ہے۔

تعلیم ہر انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن کوئی بھی فرد واحد اپنا یہ حق خود وصول نہیں کر سکتا بلکہ یہ ذمہ داری معاشرہ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ فرد واحد کے تقاضہ کرنے سے پہلے یہ حق اس کو ادا کر دے۔ یورپی ممالک نے اس کڑی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنی اپنی سرحدوں کے تمام افراد کے لیے اس قدرتی نعمت کو لازمی قرار دے دیا اور ایسے انتظامات کر دیئے کہ ہر فرد اس سے پورے طور پر بلا مزد و معاوضہ مستفید ہوتا رہے۔ اور خصوصیت اس نظام کی یہ ہے کہ بنیادی تعلیم کے اختتام تک بچے کی عمر کا لحاظ ملحوظ رکھا جاتا ہے تاکہ عملی زندگی میں اُسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اسی حکمتِ عملی کے تحت بنیادی تعلیم کے دوران کسی فیل یا پاس کا کوئی گورکھ دھندا کارفرما نہیں ہے اور سب سے خوبصورت پہلو اس نظام کا یہ ہے کہ جماعتوں کا آغاز موسم گرما کی تعطیلات کے اختتام سے شروع ہوتا ہے اور موسم گرما کی تعطیلات ہی پر موقوف ہو جاتا ہے جس سے بچے خالی الذہنی سے تعطیلات کا لطف اٹھاتے ہیں۔ کچھ بچے مالی فائدے کی خاطر چھوٹا موٹا کام تلاش کر لیتے ہیں۔ اس نظام کا ایک درخشندہ گوشہ یہ بھی ہے کہ بچوں کو ان کی حیثیوں کے عین مطابق تیار کیا جاتا ہے یعنی بنیادی سکول سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ان کی اہلیت اور صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ یونیورسٹی سے منسلک ہونا چاہتے ہیں یا فنی درسگاہوں سے!

ملک اور قوم کے لیے آزاد فضا برقرار رکھنے کے لیے آزاد اور زندہ اقوام اس ذمہ داری کو دیانت داری سے نبھاتے ہوئے اپنے نونہالوں کے لیے اُسی مطابقت کے ساتھ آنے والے وقت کے تقاضوں سے آگہی رکھنے کے لیے صحت مند ماحول پیدا کرتی رہتی ہیں اور اس کے دوران نئی نسل کو عیسائیت سے واجبی حد تک ہی متعارف ہونے دیا جاتا ہے تاکہ ان کی ذہنی پرواز پر پیشوائیت اور رہبانیت اثر انداز نہ ہو پائے۔

لیکن ہماری دنیا میں علم کا تصور محض حروف کی جان پہچان تک ہی محدود رہا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کے استحکام کے لیے یہ نکتہ بے حد اہمیت کا حامل رہا تاکہ محکوم کو اس علم کے ادراک و آگہی سے جتنی دور رکھا جا سکے بہتر ہے۔ حالانکہ علم وہ شعلہ ہے جو ملت کے قلب و ذہن میں اگر اتر جائے تو وہ مکمل طور پر مرصع، مسجع معترلی اور مقفیٰ ہو جائے مگر ایسا نہیں ہو رہا لہٰذا اس ادراک و آگہی کے فقدان کی مثال ۱۶ اگست ۸۷ء کے.....

نوائے وقت کراچی کی اشاعت میں دو کالم کلیدی حیثیت کے حامل ہیں "منہاج القرآن" اور "نور بصیرت" منہاج القرآن کا انداز جماعت اسلامی کی طرح پیشوائیت کا ہے لہٰذا اس پر کچھ لکھنا ہی وقت کا زیاں ہے۔ دوسرا کالم "نور بصیرت" میاں عبدالرشید صاحب کا ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ پیر پیران سید عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں۔

"ایماندار کے لیے دنیا قید خانہ ہے اور عارف کے لیے یہ مقام شکر ہے۔ عارفوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے شوق اور اپنے انس اور طلب کی شراب پلا رکھی ہے۔ وہ مخلوق کی طرف نہیں دیکھتے۔

انہیں مخلوق کی طلب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ راضی برضا کی جنت میں ہیں۔ وہ دنیا ہی میں اپنے نفسوں پر قیامت کر چکے ہیں ؎

سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی
بگیر تم کہ نہ بینی قیامت موجود (اقبال)

ترجمہ: تو اعمال نامے اور میزان اعمال کی بہت باتیں کرتا ہے مگر میں حیران ہوں کہ تجھے وہ قیامت نظر نہیں آتی جو تیرے سامنے موجود ہے۔"

علامہ اقبالؒ کا کلام اور ترجمہ میاں صاحب نے درج کیا ہے۔ کیا یہ ادراک و آگہی کے فقدان کی دلالت ہے کہ نہیں! ایماندار اور عارف دونوں کے لیے ہی یہ دنیا بیکار سی شے ہے۔ اس قسم کی تعلیم سے کون سی قوم سائیٹسٹ پیدا کر سکتی ہے۔ ہاں۔ البتہ مکیر کے فقیر پیدا اور تیار ہوتے چلے جائیں گے۔ مغربی اقوام کے محققین نے ایک نئی طرح ڈالی ہے کہ خارجی کائنات بھی دیگر سیاروں کی طرح گول ہے۔ عارف اور ایماندار تو اس کا سننا بھی گناہِ عظیم تصور کریں گے۔ یہ بھی انتشار کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔

ترقی کی بلندیوں کو چھونے والی جمہوریت پسند اقوام اپنے قوانین کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتی ہیں ان کی ہر ادا میں اجتماعیت کی جھلک ملے گی۔ ان کے شہروں کی تقسیم، مکانات کی بناوٹ و سلسلہ اور لباس میں یکسانیت ہی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہری عناصر ان کی اجتماعیت، قومی وقار اور مرتبے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ادھر ہماری سرزمین پر بے ہنگم عمارتیں، اپنی مرضی اور پسند کے مکانات اور کاروباری سلسلے ایک بہت بڑے انتشار کا عملی نمونہ ہیں۔ جو انفرادیت کا مظہر ہوتا ہے۔

عوام کے لئے آمد و رفت کی سہولتوں کا قطعی فقدان ہے۔ ٹریفک کا جو بے ہنگم اژدہام نظر آتا ہے وہ مکمل طور پر انفرادیت کا شکار ہے۔ آمد و رفت کی سہولت کا بہم پہنچانا حکومت کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ مگر اس کی طرف سے جاری کردہ ٹرانسپورٹ کی حالت اس قدر ابتر ہے کہ وہ ٹرانسپورٹ کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ ورکشاپ نااہلوں کی سرپرستی میں محض لوٹ کھسوٹ کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ ٹیکسی ناپید ہے موٹر رکشا کے میٹر ڈرائیور کی مرضی کے تابع ہیں۔ اور عوام کی استطاعت سے کہیں باہر۔ ویسے بھی موٹر رکشا ایک چھوٹی سی فیملی کیلئے قطعی ناموزوں اور ناکافی ہے۔

بجلی، ٹیلی فون کے بچھے ہوئے بے ہنگم جال کارندوں کی نااہلی، بے مائیگی اور بے حوصلگی کے مظہر ہیں یہ انتشار اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ملک و قوم کی خدمت پر مامور افراد دل کی گہرائیوں سے کام نہیں کر رہے۔ بجلی، گیس اور ٹیلی فون فی زمانہ زندگی کی اہم ترین ضروریات ہیں۔ ان سب کا حصول کوہ کنی کے مترادف

ہوچکا ہوا ہے۔ ٹیلی فون کا انتظار کرتے کرتے کئی افراد قبرستان پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

لاقانونیت اور انتشار اس قدر پھیل چکے ہیں کہ سمگلروں نے تحریری درخواست کی ہے کہ انہیں سمگلنگ کی اجازت دی جائے۔ یہ خبر پاکستان کے نامور اُردو اخبار کی ۲۴ مئی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں تھی۔ "تین ماہ کے لیے اسمگلنگ کی اجازت دی جائے۔ کراچی کے سمگلروں کی حکومت سے درخواست۔ ۲۶ مئی۔ سٹاف رپورٹر کراچی کے بدنام اسمگلروں نے کچھ عرصہ قبل حکومت کو تحریری درخواست ارسال کی تھی جس میں انہوں نے پیش کش اور اپیل کی تھی کہ اگر انہیں تین ماہ کے لئے اسمگلنگ کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہ پاکستان سے منشیات اور دیگر اشیاء اسمگل کر کے اتنی دولت سمیٹ لائیں گے کہ پاکستان پر واجب الادا تمام غیر ملکی قرضے اس رقم سے اتار دیں گے اور ملک میں سونے کے انبار لگا دیں گے۔ یہ بات ہفت روزہ تکبیر کے مدیر جناب صلاح الدین نے انسداد منشیات کے ضمن میں ذرائع ابلاغ کانفرنس کے آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ اس تحریری درخواست کی تصدیق ایک اعلیٰ فوجی افسر نے بھی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسمگلروں نے درخواست میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستان میں جو سونا نظر آتا ہے۔ وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

۲۵ اگست۔ یہاں پر سویڈش ٹیلی ویژن نے ایک فلم دکھائی ہے۔ جو انہوں نے پاکستان کے ساحلی علاقہ میں فلمائی ہے۔ اس علاقہ میں پانی میں کھڑے پرانے سمندری جہاز توڑے جاتے ہیں۔ اس کے محلہ وقوعہ اور ضروری سامان کی غیر موجودگی اس بات کی غمازی ہے کہ یہ غیر قانونی ہو سکتا ہے۔ کوئی خورشید صاحب ہیں جنہوں نے سویڈن سے پرانا بحری جہاز ۳ کروڑ روپے میں خریدا ہے۔ اس فلم میں لال دین قریشی صاحب نے اُردو میں ضروری اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ اس غیر قانونی پراجیکٹ میں ایک صدسے قریب مزدور وابستہ ہیں ان کے لیے ایک ڈاکٹر بھی ہے جس کا نام رسی رضا ہے۔ مزدوروں میں سے افضل نے تمام مزدوروں کی ترجمانی کی ہے۔ اس کے بقول تمام لوہے کا کام ننگے ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے۔ سہولت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ سب مزدور سرحدی علاقوں سے متعلق ہیں اور ۴ روپے یومیہ پر کام کرتے ہیں اس جگہ کا نام بوگنڈی بتایا گیا ہے۔

سیالکوٹ میں اگوکی کی سڑک تعمیر ہو رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے سڑک کے آغاز پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر حسب ذیل تحریر موجود تھی سڑک ــــ سے اگوکی کی تعمیر۔ ..... ٹھیکیدار بشیر احمد حصول ٹھیکہ بوساطت شمیم احمد (نادایم پی اے) انتشار کا یہ عالم کہ قانون کی دیدہ دلیری سے دھجیاں اُڑتی نظر آرہی ہیں۔ بقول شخصے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے خیال رہے کہ آوا خود بگڑ سکنے کا اہل نہیں ہوتا شخص واحد اس کا کُلی ذمہ دار ہوتا ہے۔

انگریز نے اپنے مفادات کی نشو ونما کے لئے ہندوستان کی سرزمین پر کچھ اس قسم کے نوآبادیاتی قوانین نافذ کئے تھے جن میں ابہام کا مبالغہ حلول کر دیا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت ان ابہام کا فائدہ سرکار پرستوں کو دیا جا سکے۔ انگریز چلا گیا۔ جمہوریت سے آمریت تک ہر طرح کے نظام ملک میں رائج ہوتے رہے۔ آئین کی دھجیاں اڑتی رہیں اور قانون رہی گورے صاحب کا چلتا رہا۔ اب ابہام کا فائدہ زر پرستوں کو منتقل ہو گیا۔ انگریز ابہام کا استعمال انتہائی ضرورت کے تحت کرتا تھا مگر اب تو ابہام قانونی شکل اختیار کر چکا ہے اور لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار گرم ہے الاماں! . . . . ملک میں کالا دھن بڑھتا جا رہا ہے۔ کون کیا، کیسے اور کیوں کر رہا ہے۔ قوم اور ملک کی کسے پروا ہے۔

پاکستان ریلوے کا ذکر خیر بھی ضروری ہے۔ دنیا کے تمام ممالک اپنی اپنی ریلوے پر فخر کرتے ہیں اور روز بروز اس میں وقت کی رفتار کے مطابق تبدیلی اور اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا وطن عزیز اب اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ریلوے کا نظام موجود ہے۔ چاہے مذاق ہی کیوں نہ ہو . . . ادھر وزیر مملکت برائے ریلوے جناب اسلم خٹک صاحب اپنے شعبہ سے ہٹ کر بیروزگاری کا رونا رو رہے ہیں۔ وزیر موصوف بیروزگاری ختم کرنے پر قدرت تو نہیں رکھتے البتہ اس میں کمی ضرور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور پاکستان ریلوے مذاق سے نکل کر حقیقت کی طرف شاید لوٹ سکے۔ اور صوبوں کی تقسیم کا ان سے کیا تعلق۔ خٹک صاحب ریلوے کی کارکردگی تک اگر محدود رہیں تو شاید ٹرینیں وقت پر دوڑنا شروع کر دیں۔ بشرطیکہ ان کے پاس مسافر ڈبے اور انجن معقول تعداد میں ہوں تب!

یہاں ڈنمارک کے اسکولوں میں بچوں کو جغرافیہ کے درس میں بتایا جاتا ہے کہ صحرائی ممالک کے علاوہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو پہاڑوں اور دیگر وسائل کے باوجود جنگلات سے بے نیاز ہے۔ ان چالیس برسوں میں ہر سال مہم شجرکاری ہوتی رہی ہے اور ہر دفعہ کوئی اعلیٰ عہدیدار ہاتھ میں چاندی کا بیلچہ لئے پودا لگاتا دکھایا گیا جس کے نتیجہ پر اب کم از کم چالیس درخت ہونے چاہئیں اور اغلب ہے کہ ہیں۔ اب تو ہر شہر میں بورڈ نظر آتے ہیں جن پر نمایاں طور پر لکھا ہوا ہے "درخت لگاؤ۔ جنت میں مقام بناؤ"۔ مگر عوام کو روٹی کمانے سے فرصت کہاں جو وہ جنت کی چھاؤں کا بندوبست کرے۔ اس سال ہر سال کی طرح مہم شجرکاری کا آغاز ہو رہا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس دفعہ ۱۱ کروڑ ۲۳ لاکھ پودے لگانے کا ہدف ہے۔

یہ تمام منصوبے، سکیمیں انتشار کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کاغذ کی ناؤ کی طرح جو بارش کے پانی میں بہہ نکلتی ہے۔

پچھلے دنوں شہر لاہور کے ایک مشہور و معروف مقام پر ایک عجیب منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چند احباب کو عشا کے بعد نکلتے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ احباب مذہبی حد بندیوں کے لحاظ پر پورے اترتے تھے۔ یعنی پاجامہ ٹخنوں تک، کپڑے کی ٹوپی اور بیک داڑھی سے بھی آراستہ تھے۔ ان میں سے تین ایک موٹر سائیکل پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ خوبی اس واقعہ میں یہ تھی کہ مذہب پر تو ان میں ارشاد خدا کی عبادت اس کے قانون کے تحت تو ادا ہو گئی، مگر موٹر سائیکل کے آگے پیچھے روشنی مفقود تھی۔ مذہب

باقی ص۱۳ پر